علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذا اھتدیتم

طلوعِ اسلام

December 1939

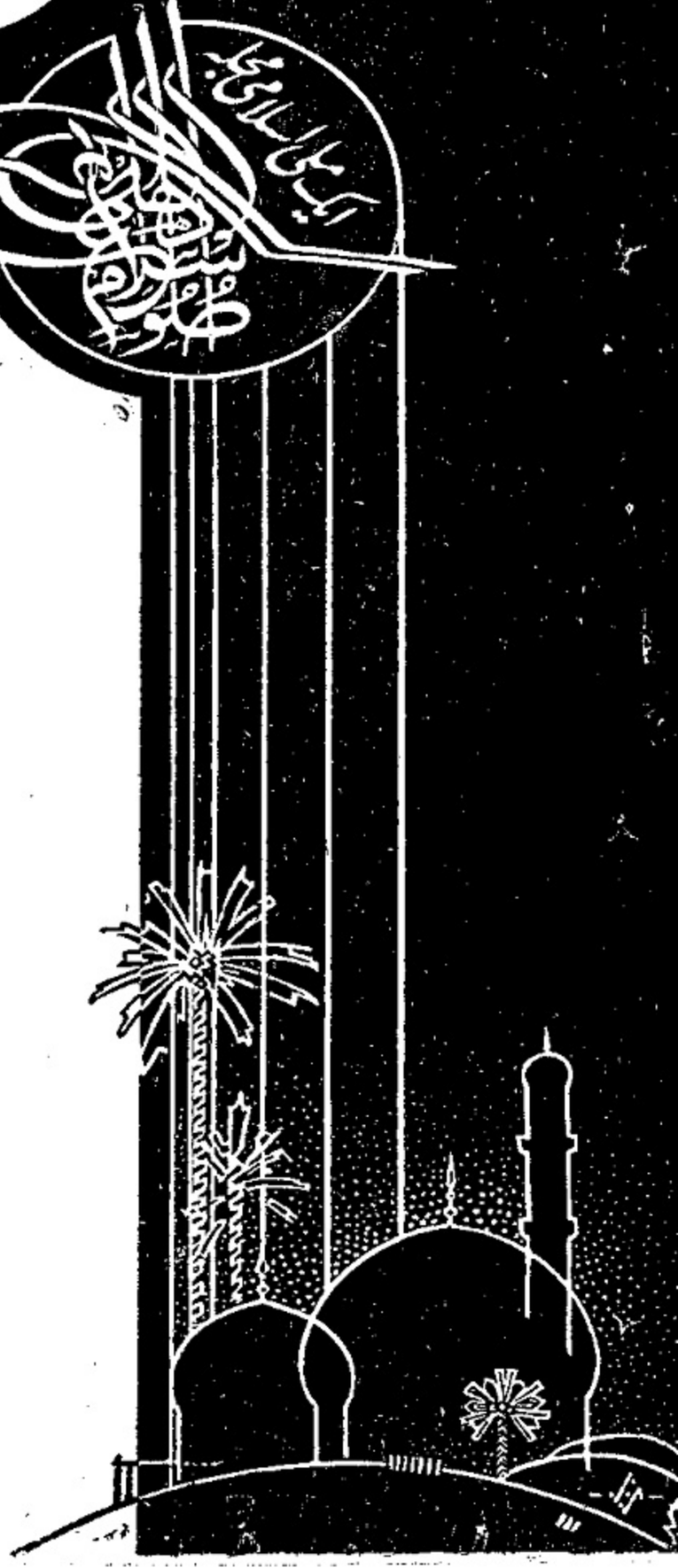

بیادگار حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مرکزِ ملت ← لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ! مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ → مرکزِ ملت

فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَہُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِہِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا

مرکزی فیصلوں کی اطاعت ہی ایمان ہے

یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا!

اِعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا — اللہ کی رسی کو سب مل کر مضبوطی سے تھام لو اور اس علیحدہ مت ہو

اِسْتَجِیْبُوْا لِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاکُمْ لِمَا یُحْیِیْکُمْ — بات مانو اللہ اور رسول کی جب وہ تمہیں اس بات کی طرف بلائے جو تمہیں زندگی عطا کرتی ہو

یعنی

مرکز، مرکز کی اطاعت اور جماعت پیدا کرو

اس لیے کہ

جو جماعت سے علیحدہ ہوا وہ جہنم میں گیا

عَلَیْکُمْ بِالْجَمَاعَۃِ فَاِنَّہٗ مَنْ شَذَّ شُذَّ فِی النَّارِ

(فرمانِ رسول)

جماعت کے بغیر اسلام کچھ نہیں !

لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِالْجَمَاعَۃِ

(قول حضرت عمرؓ)

(اقبال)

چیست ملت اے کہ گوئی لا الٰہ — با ہزاران چشم بودن یک نگاہ

بگذر از بے مرکزی پائندہ شو

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی حیات اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوع اسلام

دہلی

(دورِ جدید)

مرتبہ

محمد ظہیر الدین صدیقی۔ بی ایس سی

بدل اشتراک

پانچ روپیہ سالانہ

ششماہی

فی پرچہ ۸ر

تین روپے

جلد ۲ شمارہ ۸

شوال ۱۳۵۸ھ، مطابق دسمبر ۱۹۳۹ء

فہرست مضامین

۱	قومیت	حضرت علامہ اقبالؒ	۳
۲	لمعات	ادارہ	۴-۱۵
۳	طلوع اسلام	اسد ملتانی	۱۶
۴	سلیم کے نام.....	چودھری غلام احمد صاحب پرویز	۱۷-۲۶
۵	ہندو مسلمانوں کی مشترکہ دلچسپیاں	محمد اکرم خاں صاحب مدیر شمس	۲۷-۳۱
۶	تبصرہ	ادارہ	۳۲
۷	متحدہ قومیت اور اسلام	شمس العلماء مولانا عبدالرحمٰن صاحب	۳۳-۴۱
۸	تبرکات	حضرت علامہ اقبالؒ	۴۲-۴۴
۹	عورت کی حیثیت	شیخ سراج الحق صاحب	۴۵-۴۸
۱۰	اسلام اور جمہوریت	ایک مسلمان	۴۹-۶۲
۱۱	حقائق و عبر	ادارہ	۶۳-۷۱
۱۲	حقیقت حج	علامہ محمد اسلم صاحب جیراجپوری	۷۲-۸۱

وطنیت

اِس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور

اِن تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یہ بُت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے
غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اِسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے

اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

اقبالؒ

لمعات

حکیم الاُمت حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کے مزار کی تعمیر کے سلسلہ میں تمام ابتدائی مراحل طے ہوچکے ہیں اور مجلس انتظامیہ نے عمارت کا عملی کام ہاتھ میں لے لیا ہے۔ عمارت کے لیے بیس پچیس ہزار روپیہ کے صرفہ کا تخمینہ ہے اور یہ رقم کچھ ایسی نہیں ہے جسے عام چندہ سے فراہم کرلینا مشکل ہوتا۔ لیکن ہمیں مجلس انتظامیہ کے اس فیصلہ سے بڑی مسرت ہوئی کہ انہوں نے اس پیامبر خودی وخودداری کے مزار کے لیے ہر کھلے دروازے پر جھولی پھیلانا مناسب نہیں سمجھا، بلکہ تجویز یہ ہے کہ صرف وہی حضرات جنہیں حضرت علامہ سے قلبی عقیدت ہے اور جنہیں ایک جہت سے انکا "حلقۂ احباب" کہا جاسکتا ہے۔ اس میں شرکت کریں۔ اس غرض کے لیے مختلف مقامات کے ارادتمندانِ اقبال کی توجہ انفرادی طور پر بھی منعطف کرائی گئی ہے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ حلقۂ طلوعِ اسلام اپنے آپ کو اس زمرہ میں شامل ہونے کا بجا طور پر مدعی سمجھ سکتا ہے۔ اور اسپر جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔ بنابریں ہم جملہ قارئین طلوع اسلام کی توجہ اسطرف مبذول کراتے ہوئے متوقع ہیں کہ اس سعادت کے حاصل کرنے والی جماعت میں یہ سب سے پیش پیش ہونگے۔ انشاءاللہ العزیز۔

ہمارے محترم جناب خواجہ عبدالرحیم صاحب آئی سی ایس ۲ سانده روڈ۔ لاہور اس مجلس انتظامیہ کے معتمد ہیں ترسیل زر انہی کے نام کیجائے۔

اس حقیقت کے دہرانے کی اب زیادہ ضرورت نہیں کہ موجودہ تحریکِ "آزادی" سے ہندوؤں کا مفہوم جمہوریت کے ڈھونگ میں ہندو راج کا قیام ہے۔ ہر وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ نے تھوڑی سی بھی سیاسی بصیرت عطا کی ہے۔ وہ اس حقیقتِ نفس الامری کے لیے کسی دلیل کا طالب نہیں ہوسکتا۔ یہ اختیارات انگریز کے ہاتھوں سے آہستہ آہستہ ہندوؤں کے ہاتھوں میں منتقل ہو رہے ہیں۔ اور اسکی دوسری

قسط فیڈریشن کی اسکیم تھی۔ ہندو میدانِ سیاست میں تو آگیا ہے لیکن قرنہا قرن کا بنیاپن اس طرح اس کی فطرت میں سرایت کر چکا ہے کہ وہ کسی مقام پر اپنا مظاہرہ کرنے سے نہیں چوکتا۔ فیڈریشن خالص ہندو حکومت کا نام تھا۔ لیکن اس میں چونکہ کچھ شعبہ جات انگریز کے ہاتھوں میں رہتے تھے۔ اسلیئے ہندوؤں کی بقالی نے کچھ بھاؤ چڑھانا شروع کیا۔ کہ انگریز سے کچھ اور بھی وصول کیا جائے ان کی بدبختی کہ عین اسیوقت مسلمانوں نے بھی یہ خطرہ محسوس کر لیا کہ مجوزہ فیڈریشن کے نفاذ سے اُن کی ملّی ہستی کس طرح تباہ ہو جائیگی۔ اسلیئے انھوں نے اس کی مخالفت شروع کر دی۔ اُدھر یورپ کے سیاسی مطلع پر جنگ کے بادل چھا گئے۔ ان تمام اسباب و علل کا نتیجہ یہ ہوا کہ فیڈریشن ایک عرصہ کے لیئے معرضِ التوا میں پڑ گئی۔ ہندوؤں کو اپنی اس غلطی کا کتنا شدید احساس ہے اسکا اندازہ ڈاکٹر مونجے کی اس تقریر سے لگایئے جس میں وہ فرماتے ہیں:۔

"کانگرس فیڈرل اسکیم (مجوزہ گورنمنٹ آف انڈیا) کے قبول نہ کرنے سے ایک شدید غلطی کی مرتکب ہوئی ہے اسلیئے کہ اس سے ہندوؤں کے ہاتھ سے یہ موقع نکل گیا کہ وہ اپنی زبردست اکثریت کی بناء پر مرکزی اسمبلی کو اپنے قبضہ اقتدار میں لے آتے۔" ہندوستان ٹائمز ۲۴/۱۱ ۲۳

یہ احساس کچھ ڈاکٹر مونجے ہی کو نخل درآتش نہیں کر رہا بلکہ کانگرس کے ارباب حل وعقد کو بھی جلے پاؤں کی بلی بنا رہا ہے۔ چنانچہ جن حضرات کی نگاہیں رفتار زمانہ اور انگلیاں نبضِ کانگرس پر ہیں انہوں نے محسوس کیا ہوگا کہ پچھلے دنوں سے کانگرسی حلقوں میں جو خلجان و انتشار پیدا ہو رہا ہے وہ اُن کی قلبی تشویش اور ذہنی کاوش کا آئینہ دار ہے۔ غلطی پر غلطی یہ کہ کانگرسی وزراء سے استعفےٰ بھی دلوا دیئے گئے۔ اب حالت یہ ہے کہ:۔

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں

آئے دن ورکنگ کمیٹی کے اجلاس ہوتے ہیں، بیانات شائع کیئے جاتے ہیں۔ گھنٹوں نہیں دنوں ارباب بست وکشاد مِل بیٹھ کر سر جوڑتے ہیں۔ ہر ایک آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا ہے کہ کہیں سے گاندھی جی کی "اندرونی روشنی" کی کوئی کرن نظر آجائے۔ لیکن اس دیئے میں تیل چھوڑ شاید بتی بھی باقی نہیں رہی۔

انھیں اب سوجھتی ہے تو صرف اتنی کہ بھیّا چرخہ کاتو اور کھدّر بُنو۔ رام بھلی کریگا۔ کبھی کھسیانے ہوکر اِس ساری ناکامی کا الزام مسلمانوں کے سر دھرا جاتا ہے۔ وہی مسلمان جنکے متعلق بار بار کہا گیا ہے کہ یہ تو محض مالِ غنیمت میں حصّہ بٹانے والے ہیں۔ میدانِ جنگ میں آنیوالے نہیں۔ انہی کے متعلق اب یہ کہا جا رہا ہے کہ جب تک ان کی حمایت حاصل نہیں ہوگی۔ سول نافرمانی نہیں کی جا سکتی۔ اسلیئے کہ گاندھی جی خوب جانتے ہیں کہ جنگ کے زمانے کی سول نافرمانی۔ نمک سازی کی سول نافرمانی نہ ہوگی۔ یہاں تو سر سے کفن باندھ کر میدان میں آنا ہوگا۔ اور کفن بدوش صرف مسلمان رضاکار ہی ہو سکتا ہے۔ ہندوؤں کو کیا معلوم کہ جان دینا کسے کہتے ہیں۔ اُنکے تو لغت میں "شہید" کے لیئے کوئی لفظ ہی نہیں۔ باور نہ ہو تو دہلی سے شائع ہونے والے اخبار "تیج" کی پیشانی دیکھیے۔ ہاں تو ہندو کو معلوم ہے کہ مسلمان اب ان کے بھرّے میں نہیں آسکتا۔ اسلیئے شرط یہ لگائی گئی ہے کہ جب تک مسلمان کی حمایت حاصل نہ ہوگی کوئی قدم آگے نہیں بڑھایا جائے گا کہ نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچیگی اور یہ بھی کہتے ہیں کہ خطرہ ہے کہ اگر ہم نے سول نافرمانی کی تو مسلمان فساد کرینگے۔ ان سے پُوچھیے کہ نافرمانی تو آپ کرینگے حکومت کے قوانین کی مسلمانوں کا کیا بگڑے گا جو وہ آپ سے فساد کرینگے۔ سیدھی بات کیوں نہیں کہتے کہ کچھ ایسے جال سے اُکھڑے ہیں کہ اب پاؤں کہیں ٹکتا ہی نہیں۔

یہ حشر ہوتا ہے اس قوم کا جس کی سیاست کی اساس حقائق ابدی پر نہ ہو اور جو انسانوں کو منزہ عن الخطا دیوتا بنا کر ان کی پرستش شروع کر دے۔

فیڈریشن تو گاؤ خورد ہوگئی۔ لیکن اب ہندوؤں کی طرف سے اسی چیز کو ایک اور اسکیم کی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اور اسکا نام ہے (Constituent Assembly) اس کی تفسیر آپ کو اس ریزولیوشن میں ملے گی جو اوائل نومبر میں کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے اپنے اجلاس منعقدہ الہ آباد میں پاس کیا ہے۔ انگریز سے مطالبہ یہ ہے کہ ہندوستان کی آبادی کے تناسب سے ایک مجلس مرتب کی جائے۔ اور جس قسم کا آئین یہ مجلس وضع کرے وہی مُلک میں نافذ

کردیا جائے۔ کیسی صاف اور سیدھی بات کہی ہے! اب اس پر بھی مسلمان رضامند نہ ہو تو اُس کی "ضد" کا کیا علاج! مجوزہ اسمبلی میں تناسب بلحاظ آبادی ہوگا۔ پینتیس کروڑ میں سے چوبیس کروڑ ہندو، نو کروڑ مسلمان اور بقایا دیگر جماعتیں، فیصلہ آئینِ جمہوریت یعنی اکثریت کی رُو سے ہوگا۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ ریزولیوشن میں یہ بھی موجود ہے کہ فرقہ وارانہ معاملات کے متعلق فیصلے اقلیتوں کی رضامندی سے ہونگے۔ یہ حصّہ واقعی بظاہر اطمینان بخش معلوم ہوتا ہے لیکن سوال پھر وہی پیدا ہوتا ہے کہ کون سے معاملات فرقہ وارانہ مسائل کی حدود میں آئیں گے۔ یہ تو وہی بات ہے جو اس سے قبل ہزار مرتبہ دُہرائی جا چکی ہے۔ یعنی ہندوؤں کی طرف سے ہمیشہ یہ کہا جاتا ہے کہ "مذہبی معاملات" میں اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ ہو جائے گا۔ اور مذہبی معاملات کی تفصیل پوچھی جاتی ہے تو وہ نماز اور پرارتھنا، باجا اور گانے سے آگے نہیں بڑھتی۔ ایسی ہی تشریح "فرقہ وارانہ معاملات" کی ہو سکتی ہے۔ بالخصوص اِس لیے کہ اس ریزولیوشن سے دو ہی روز پہلے اخبارات میں مولانا آزاد کے اِس فارمولا کا ذکر آ چکا ہے جو اُن پر فرقہ وارانہ قضیہ کے حل کے لیے سمار وار دھا سے نازل ہوا ہے۔ اِس فارمولا کی رُو سے کانگریسی ارکان کو ہدایت کی جائیگی کہ وہ مسلمانوں کو سمجھائیں کہ وہ ذبیحہ گاؤ کے معاملہ میں ہندوؤں کے جذبات کا احترام کریں۔ اور ہندوؤں سے کہا جائے گا کہ وہ مساجد کے سامنے باجہ بجانے میں رواداری سے کام لیں۔ یعنی مولانا آزاد کے نزدیک۔ جنکے متعلق گاندھی جی نے حال ہی میں کہا ہے کہ مسلمانوں سے متعلقہ مسائل کے بارے میں کانگرسی حلقوں میں اُن کی رائے قول فیصل سمجھی جاتی ہے۔ مسلمانوں کے تمام مذہبی حقوق کا تحفظ ہو جائیگا اگر ہندو مساجد کے سامنے باجا بجانے سے احتراز کریں اللہ اکبر! یہ ہیں وہ مولانا آزاد جو کبھی حکومتِ خداوندی کے قیام کا وعظ فرمایا کرتے تھے ہندو تو اس بات کو سمجھ نہیں سکتا۔ یا سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا کہ مسلمانوں کے نزدیک مذہب کے کیا حدود ہیں۔ ان میں کا سب سے بڑا داماغ جسے انہوں نے دیرتا کا رتبہ دے رکھا ہے

گاندھی جی ہیں۔ اسلام کے متعلق ان کی معلومات جس جہالت کا مظاہرہ کرتی ہیں وہ ان کے ان بیانات سے صاف ظاہر ہوتی ہے جو وہ پچھلے دنوں سے قرآن وسنت سے متعلق شائع کر رہے ہیں۔ لیکن افسوس ہے ان مسلمانوں پر جو ان کے گرد و پیش رہتے ہیں اور انہیں نہیں بتاتے کہ مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا دائرہ کیا ہے۔ مثال کے طور پر مسئلہ سود کو لیجئے۔ ہندوؤں کے نزدیک یہ ایک خالص معاشی مسئلہ ہے۔ لیکن مسلمانوں کے نزدیک عین مذہبی۔ سو جب تک ہندو ارباب سیاست مسلمانوں کے اس نکتۂ نظر کو سمجھ نہیں لیتے مسئلہ ہند کی گتھی سلجھ نہیں سکتی۔ گاندھی جی اور ان کی کانگریس نے بڑا اینڑ مارا کہ کانسٹیٹوئنٹ اسمبلی کی تشکیل کے لئے "بعد از خرابی بسیار" مسلمانوں کے مطالبۂ جداگانہ انتخابات کو تسلیم کر لیا۔ لیکن ہندو مسلم سوال کا حل صرف طریقہ انتخاب میں ہی نہیں۔ یہ تو ایک فرعی چیز ہے۔ اصل چیز تو مسلمانوں کے صحیح نقطۂ نظر کا سمجھنا ہے۔

پھر آپ نے دیکھا کہ کانگریس کے مذکورہ صدر ریزولیوشن کی رو سے اقلیتیں کون کونسی ہیں مسلمان اور سکھ! بچارے اچھوت چلا رہے ہیں کہ ہم ایک الگ قوم ہیں ہماری نیابت الگ ہو ہمارے انتخابات جداگانہ ہوں۔ لیکن چونکہ ان کی آواز میں کوئی زور نہیں اس لئے ان کی کوئی نہیں سنتا۔ اور ہندو سنیں بھی کیوں۔ سن لیں تو پھر انکی اکثریت کہاں رہے! انکی اکثریت کا تو راز ہی ایسی مختلف اقوام کو خواہ مخواہ ہندوؤں کی صف میں گھسیٹنے میں ہے۔ کتنے ایسے فرقے ہیں جنہیں ہندو یت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ وہ ویدوں کو نہیں مانتے۔ حتیٰ کہ خدا کو بھی نہیں مانتے بایں ہمہ انہیں زبردستی ہندوؤں کے کل کا جز قرار دیا جا رہا ہے ہندوؤں کی تو حالت یہ ہے کہ۔

آنکھ نرگس کی دہن غنچے کا حیرت میری ان کی تصویر میں پوچھے کوئی ان کا کیا ہے

اس کی تفصیل دیکھنی ہو تو سوامی دیانند کی مشہور کتاب ستیارتھ پرکاش کا گیارہواں

سمولاس دیکھئے۔ ہاں! یہ سب فرقے ہندو ہیں لیکن اس ریزرویشن کی رو سے سکھ اقلیتوں میں شامل ہیں۔ اس لئے کہ پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت کمزور ہی اس شکل میں ہو سکتی ہے کہ سکھوں کو جداگانہ اقلیت قرار دے کر مخصوص مراعات دیجائیں۔ حالانکہ اچھوتوں اور ہندوؤں کی نہ باہم شادیاں ہوتی ہیں نہ خورد و نوش اکٹھا ہے۔ اور سکھوں اور ہندوؤں کی باہم شادیاں بھی ہوتی ہیں اور خورد و نوش میں بھی کوئی تمیز نہیں بایں ہمہ سکھ ہندوؤں میں شامل نہیں یہ ہے مختصراً کانسٹیٹوئنٹ اسمبلی کی تفصیل جس کی تشکیل کے لئے کانگریس کے اربابِ حل و عقد کوشاں ہیں اور جو گاندھی جی کے تازہ ارشادات کے مطابق ہندوستان کی مصیبتوں کا واحد حل ہے یہ اسکیم ہندوؤں کے حق میں کیسی ہے۔ یہ بھی انہی ڈاکٹر مونجے صاحب کے الفاظ میں سنئے جو اس وقت تک کفِ افسوس مل رہے ہیں کہ کانگریس نے فیڈریشن کو کیوں قبول نہ کرلیا وہ فرماتے ہیں۔

"حکومت برطانیہ کانگریس کی طرف سے کانسٹیٹوئنٹ اسمبلی کا مطالبہ کبھی تسلیم نہ کریگی۔ اس لئے کہ حکومتِ برطانیہ کو تولنا ہوگا کہ پنجاب کی طرف سے سپاہی اور گاندھی جی کی طرف سے صرف اخلاقی ہمدردی میں سے کونسی پیش کش زیادہ وزنی ہے" (ہندوستان ٹائمز) ۲۳ $\frac{11}{39}$

اس کے بعد مسلمان نیشنلسٹ حضرات سے پوچھئے کہ کیا یہی ہے وہ اسکیم جس کے متعلق آپ قرآن اٹھا اٹھا کر مسلمانوں کو یقین دلا رہے ہیں کہ یہ بالکل آبِ حیات ہے آنکھیں بند کرکے پی جاؤ۔

مسلمانوں کا اپنا پریس نہ ہونے کی وجہ سے ملتِ اسلامیہ کو کس قدر نقصان پہنچ رہا ہے اس کے متعلق لمبے چوڑے مضامین لکھنے اور دھواں دھار تقاریر کرنے کی ضرورت نہیں یہ وہ کمی ہے جسے ہر شخص محسوس کرتا ہے۔ اور جوں جوں زمانہ برق رفتاری سے آگے بڑھتا جارہا ہے اس احساس کی شدت بھی بڑھتی جارہی ہے۔ کہا جاتا ہے اور اس میں کسے کلام

ہے کہ کسی مقصد کے حصول کے لئے عملی اقدام کی ابتدا احساس سے ہوتی ہے لیکن ہمیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنے طرزِ عمل سے جہاں اور بیسیوں مسلّمات کی تغلیط کر رکھی ہے۔ ان میں یہ مسلّمہ بھی شامل ہے ایک مدت دراز سے مسلمانوں کے در و دیوار سے اس احساس کی آواز آ رہی ہے لیکن اس کے لئے عملی قدم آج تک کوئی نہیں اٹھا۔ ان کا احساس ایک مفلوج کا احساس معلوم ہوتا ہے۔ کہ

آتی ہے صدائے جرسِ ناقۂ لیلےٰ
صد حیف کہ مجنوں کا قدم اٹھ نہیں سکتا

اسی صحیح شدت احساس کا مظاہرہ ہے وہ اپیل جو پچھلوں دنوں آنریبل سر فضل الحق صاحب وزیر اعظم بنگال کی طرف سے اخبارات میں شائع ہوئی ہے جس میں انہوں نے تحریر فرمایا ہے کہ وہ اپنی تمام توجہات و مساعی ہندوستان میں اسلامی پریس کی تشکیل و ترتیب میں صرف فرمائیں گے۔ ہندوستان میں مسلمان امرا کی کمی نہیں۔ ہماری نظر میں تو ایک پنجاب میں ایسے ایسے مسلمان رؤسا موجود ہیں جن میں سے ایک ایک اگر چاہے تو نہایت شاندار روزانہ اخبارات اپنے صرف سے جاری کر سکتا ہے لیکن مصیبتیں دو قسم کی ہیں بعض تو ایسے ہیں کہ جنہیں اس امر کا احساس ہی نہیں۔ وہ صرف بارِ دولت کے حمّال ہیں۔ اور جنہیں کچھ احساس ہے وہ پریس کو اپنے اغراض و مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنانا چاہتے ہیں اس لئے وہ اس شرط پر روپیہ دینے پر آمادگی ظاہر کرتے ہیں کہ پالیسی ان کے اپنے ہاتھ میں رہے اور نہیں سمجھتے کہ بہت کم ایسے مقامات ہیں جہاں فطرت ایسی فیاض ہو کہ دولت کے ساتھ دماغ کی متاع گراں بہا بھی ایک ہی جگہ جمع کر دے صحیح طریق کار یہ ہے کہ روپے والے اپنا روپیہ دیں دماغ والے اپنا دماغ اور صاحبِ قلم اپنی خدمات ان پرزوں کی ہم آہنگی سے مشین چل سکیگی۔ ورنہ تمام کوششیں عبث اور تمام اپیلیں بیکار ہیں۔ مسلمانوں کو جناب فضل الحق صاحب کی ذات گرامی پر پورا اعتماد ہے۔ ان کے پاس جس قدر سرمایہ جمع ہوگا یقیناً محفوظ رہیگا۔ ہم جناب

فضل الحق صاحب کی خدمت میں گذارش کریں گے کہ وہ اپنی اپیل کو صدا بصحرا نہ بننے دیں بلکہ پوری سرگرمی سے اس کام کے پیچھے لگ جائیں۔ اگر وہ اس باب میں کامیاب ہوگئے تو یہ ملتِ اسلامیہ کی اتنی گرانبہا خدمت ہوگی جس کی نظیر مشکل سے ملیگی۔ واللّٰہ المستعان

اشاعتِ زیر نظر کے "حقائق و عبر" کے عنوان کے ماتحت یہ واضح کیا گیا ہے کہ مولانا آزاد کی یہ برہمو سماجی تفسیر کہ تمام مذاہب عالمگیر سچائیوں کے اعتبار سے بالکل یکساں ہیں۔ کتنی بڑی سیاسی سازش" کی تمہید تھی حقائق و عبر کا حصہ پریس میں چلا گیا تو ۲۵ نومبر کا ہریجن موصول ہوا اس میں گاندھی جی کے پرائیوٹ سکرٹری مسٹر مہادیو ڈیسائی مسٹر جناح کے عید کے براڈ کاسٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ مسٹر جناح نے باہمی محبت اور رواداری کا جو سبق دیا ہے

"اسے اگر ایک قدم اور آگے لیجایا جائے تو تمام مذاہب کے لئے یکساں عزت کی ضرورت بھی بطور بنیادی اصول کے ماننی ضروری ہے"

بالکل بجا اور درست۔ لیکن اگلا فقرہ بھی ملاحظہ فرمایئے۔

"ایک جداگانہ قوم ہونے کا تخیل پیدا ہی اس خیال سے ہوتا ہے کہ ہمارا مذہب دوسرے مذاہب پر فوقیت رکھتا ہے جونہی ہم تمام مذاہب کی یکساں عزت کی عادت پیدا کریں ہم محسوس کرنے لگجاتے ہیں کہ ہم ایک ہی نسل اور ایک ہی انسانی برادری ہیں۔"

آپنے دیکھا کہ مسلمانوں کے ذہن سے یہ چیز محو کرنے کے لئے کہ وہ ایک الگ قوم ہیں۔ کونسا حربہ استعمال کیا جا رہا ہے؟ یہ کہ تمام مذاہب اصولی طور پر یکساں ہیں اسلام کو دوسرے مذاہب پر کوئی فوقیت حاصل نہیں! خیال فرمایئے کہ مسلمانوں کے خلاف کن کن راستوں سے حملے کئے جا رہے ہیں اور یہ تیر کیسی کیسی مقدس ہستیوں کی کمانوں پر چڑھ کر چلائے جاتے ہیں

جریدۂ اسٹیٹسمین نے اپنی ۲۷ نومبر کی اشاعت کے مقالۂ افتتاحیہ میں یہ تجویز پیش کی ہے

کہ ہندوستان میں رسم الخط کا جھگڑا اٹھانے کے لئے "رومن رسم الخط" اختیار کر لینا چاہئے۔ ہم جریدۂ مذکور کو بتانا چاہتے ہیں کہ مسلمان اگر دیوناگری رسم الخط کی مخالفت کرتے ہیں تو اس لئے نہیں کہ انہیں اس رسم الخط سے کوئی خاص بیر ہے یا جس طرح گاندھی جی کو اردو زبان سے اس لئے نفرت ہے کہ وہ قرآن کے رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کو دیوناگری سے اس کے ویدوں کے رسم الخط ہونے کی وجہ سے مخاصمت ہے حقیقت یہ ہے کہ ملتِ اسلامیہ کا رسم الخط وہی ہے جسمیں عربی لکھی جاتی ہے اور مسلمان کبھی اس رسم الخط کو اختیار نہیں کر سکتے جو انہیں عربی رسم الخط سے دور لیجائے ہندوؤں کو اگر اس رسم الخط سے نفرت ہے تو وہ اپنے لئے جونسا رسم الخط چاہیں تجویز کر لیں ان پر کسی کا جبر تھوڑا ہی ہے لیکن مسلمان کو کیوں مجبور کیا جائے کہ وہ کوئی دوسرا رسم الخط اختیار کرے۔ ایک قوم کی زندگی کے لئے رسم الخط کا مسئلہ کس قدر اہم ہے یہ ہم سے نہیں بلکہ پنڈت جواہر لال نہرو کی زبان سے سنئے وہ اپنی مشہور سوانح عمری کی جلد اول ص۲۹۵ پر رقمطراز ہیں۔

"رسم الخط اور ادب کا بہت ہی گہرا تعلق ہے اور رسم الخط کی تبدیلی اس زبان کے لئے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ جس کا ماضی شاندار رہا ہو۔ رسم الخط بدلنے کے ساتھ الفاظ کی شکلیں بدلجاتی ہیں آوازیں بدلجاتی ہیں اور خیالات بدل جاتے ہیں قدیم و جدید ادب کے درمیان ایک ناقابل عبور دیوار حائل ہو جاتی ہے اور قدیم ادب ایک ایسی اجنبی زبان کا ادب بنکر رہجاتا ہے جو مردہ ہو چکی ہو"

باقی رہا یہ کہ ترکوں نے لاطینی رسم الخط اختیار کر رکھا ہے۔ اس لئے ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی رومن (یا دیوناگری) رسم الخط اختیار کر لینا چاہئے سو واضح رہے کہ ترکوں کا کوئی فیصلہ مسلمانانِ عالم کے لئے واجب الاتباع نہیں۔ ہم اپنے احوال و ظروف اور امیال و عواطف سے خود واقف ہیں اور ملت اسلامیہ کے مصالح و منافع سے آشنا۔ اس لئے ہم پر کسی کے فیصلے کی پابندی لازم نہیں۔

دو تین ماہ سے کچھ ایسی مصروفیت رہی کہ ادارہ کی طرف سے کوئی نیا پمفلٹ شائع نہیں

ہو سکا۔ بارے اس ماہ "اشتراکیت اور اسلام"، "کانگریس بے نقاب" اور "مسلمان کی زندگی" کے تین جدید پمفلٹ شائع کئے جا رہے ہیں۔ ان پمفلٹوں کے لئے فرمائشیں پہلے ہی سے جمع ہو چکی ہیں۔ اس لئے ان کی تعمیل کے بعد بہت تھوڑے پرچے سٹاک میں رہ جائیں گے لہٰذا جو احباب یہ پمفلٹ اپنے لئے خریدنا چاہیں یا تقسیم کرنا چاہیں بہت جلد اطلاع فرمائیں۔ ادارہ کی طرف سے شائع کردہ پمفلٹوں کا سٹ اب اس درجہ تک پہنچ گیا ہے کہ ان میں حالات حاضرہ سے متعلق موضوعات پر اسلامی نقطۂ نگاہ سے سیر حاصل بحث ہو گئی ہے اس لئے جو لوگ ان موضوعات سے واقفیت حاصل کرنا چاہیں ان کے لئے مکمل سٹ کا مطالعہ نہایت ضروری ہے جو مسائل اس کے بعد پیدا ہوں گے ان سے متعلق ساتھ کے ساتھ اور پمفلٹ شائع ہوتے رہیں گے۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم

ہم نے نومبر کی اشاعت کے لمعات میں لکھا تھا کہ لکھنو کے قضیہ حزبیہ کے سلسلہ میں تمام ملتِ اسلامیہ نے شیعہ حضرات اور احرار کی نیتیں کیں کہ وہ باہمی سر پھٹول کو چھوڑ کر کسی ایک اسلامی نقطہ پر جمع ہو جائیں۔ لیکن وہ نہ مانے اور اب جمع ہوئے تو اس بات پر کہ دونوں کانگریس کے جھنڈے تلے لڑینگے، اس باب میں ہمنے آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے فیصلہ کا حوالہ دیا تھا۔ ہمیں اس کانفرنس کے معتمد اعزازی جناب سید کلب عباس صاحب کا ایک گرامی نامہ موصول ہوا ہے جس میں انہوں نے فرمایا ہے کہ یہ فیصلہ آل انڈیا شیعہ کانفرنس کا نہیں تھا۔ غالباً آل انڈیا شیعہ پولٹیکل کانفرنس کا ہوگا۔ واقعہ یہی ہے جیسا کہ سید صاحب نے لکھا ہے۔ اور ہمیں افسوس ہے کہ "پولٹیکل" کا لفظ سہواً رہ جانے سے آل انڈیا شیعہ کانفرنس سے متعلقہ حضرات کو روحانی کاوش ہوئی۔ اس فروگذاشت کے لئے ہم معذرت خواہ ہیں۔

بایں ہمہ جس انداز سے یہ خبر اخبارات میں شائع ہوئی تھی اس سے مترشح تھا کہ یہ فیصلہ تمام شیعہ حضرات کا ہے۔

ہندوستان ٹائمز مورخہ $\frac{10}{29}$ ۲۶ میں لکھا تھا۔

"آل انڈیا شیعہ پولٹیکل کانفرنس کے آرگنائزنگ سکریٹری صاحب ایک بیان کے ضمن میں انڈین نیشنل کانگریس کو یقین دلاتے ہیں کہ مسلم لیگ ہندوستان کی شیعہ جماعت کی نمائندہ نہیں اور شیعہ حضرات یوپی میں کانگریسی حکومت کے رویہ کے باوجود ہمیشہ کانگرس کے وفادار رہے ہیں انہوں نے پھر یقین دلایا کہ شیعہ قومی جنگ میں ضرور شریک ہونگے" اس سے ظاہر ہے کہ یہ فیصلہ شیعہ حضرات کا من حیث الجماعت بیان کیا گیا ہے۔ ہم نے ان لوگوں کو جو اس نازک دور میں ملتِ اسلامیہ سے کٹ کر دوسروں کے ساتھ اپنا پیوند لگا رہے ہیں "کج نہاد" کہا تھا۔ اسپر سید صاحب بہت برافروختہ ہوئے ہیں۔ ہم اُن کی خدمت میں عرض کرنا چاہتے ہیں کہ ملتِ اسلامیہ میں تشتت و افتراق از روئے قرآن کریم اتنا بڑا جرم ہے کہ اسکے لیے کج نہاد کچھ ایسا سنگین خطاب نہیں ہے۔ بایں ہمہ سید صاحب ذرا اتنا سوچیں کہ انھیں اتنی سی بات پر جب اسقدر غصہ آیا ہے تو جب شیعہ حضرات اہلِ تسنن کے واجب الاحترام بزرگوں کی شان میں درشت اور نازیبا الفاظ استعمال کرتے ہیں تو انھیں کس قدر رنج ہوتا ہوگا۔

سید صاحب نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ کیا طلوع اسلام کی یہ روش "اجتماعِ ملی اور ائتلاف قلبی" کی داعی کہی جا سکتی ہے؟ قارئینِ طلوع اسلام خوب جانتے ہیں کہ شیعہ سُنی تنازع کے متعلق ہماری روش کس قسم کی رہی ہے لیکن ہم سید صاحب سے باادب دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا انھوں نے کبھی اسپر غور فرمانے کی بھی تکلیف گوارا فرمائی ہے کہ شیعہ حضرات کا طرزِ عمل کس درجہ "ائتلاف قلبی اور اجتماع ملی" پیدا کرنے والا ہے؟ لکھنؤ کی کش مکش کے دوران میں یہاں تک کہہ دیا گیا کہ ہندو اگر شیعہ حضرات کے مطالبات مان لیں تو انھیں اجازت ہوگی کہ مساجد کے سامنے باجہ بجائیں۔ اور ذبیحہ گاؤ کو قانوناً روک دیں۔ شیعہ حضرات کو ہدایت کی گئی کہ "ہندوؤں سے خرید و فروخت کریں اور مسلمانوں کا بائیکاٹ کر دیں۔ کئی بار شیعوں کے لیے مسلمانوں سے الگ جداگانہ انتخاب اور مخصوص نشستوں کی آوازیں اٹھیں۔ ابھی حال میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ شیعہ ایک جداگانہ اقلیت ہیں کیا سید صاحب یا اُن کی "آل انڈیا شیعہ کانفرنس" نے کبھی ان افتراق انگیز داعیات کے خلاف بھی

لب کشائی فرمائی ہے! دوسروں کو ائتلاف و اتحاد کی نصیحت کرنے سے پہلے خود اپنوں کی حالت پر نگاہ ڈالنی ضروری ہوتی ہے۔ طلوعِ اسلام تو از روئے قرآن کریم افتراق فی الدین کو شرک سمجھتا ہے اسلیئے اسے اجتماع و ائتلاف کی نصیحت تحصیل حاصل ہے۔

آخر میں سید صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"اسکے ساتھ یہ بھی عرض کر دینا ضروری ہو کہ اگر طلوعِ اسلام کو شیعہ پولٹیکل کانفرنس کے سیاسی رویہ سے اس قسم کا مغالطہ ہوا ہے تو وہ بھی باقی نہ رہنا چاہیئے۔ کیونکہ ۱۲ر نومبر ۳۹ء کے جلسہ میں شیعہ پولٹیکل کانفرنس نے بھی ۱۹۳۷ء والی تعاون بہ کانگرس کی تجویز پر عملدرآمد کرنے کو فی الحال ملتوی کر دیا ہے۔"

ہم حیران ہیں کہ اس دعوے کے ساتھ جب ہندوستان ٹائمز مورخہ ۲۶/۱۱/۳۹ کی یہ خبر پڑھیں تو کس نتیجہ پر پہنچیں۔

"شیعہ پولٹیکل کانفرنس (ضلع لکھنؤ) کی سنٹرل سٹینڈنگ کمیٹی نے اس امر کا ایک ریزولیوشن پاس کیا ہے کہ کانفرنس اس مکمل آزادی کی حامی ہے جس میں تمام اقلیتوں۔ بالخصوص شیعہ اقلیت کے حقوق کا تحفظ ہو۔ اس اجلاس کے خیال میں یہ ضروری ہے کہ تمام ایسی تحریکوں کے ساتھ عملی تعاون کیا جائے جو قومیت پرستی پر مبنی ہوں۔ خواہ وہ کسی پارٹی کی طرف سے وجود میں آئیں۔" اسکے بعد مسلم لیگ سے بیزاری کا اعلان کیا گیا ہے۔

کانگریس سے تعاون والی تجویز پر عملدرآمد کرنے کا التواء ایک طرف اور کانگریس کے ساتھ عملی تعاون (Active Support) کا ریزولیوشن دوسری طرف۔ شاید سید صاحب ان دونوں میں تطابق پیدا کر سکیں۔ یہ چیز ہماری سمجھ سے تو بالا ہے۔

طلوعِ اسلام

(اسد ملتانی)

شبِ تمدّنِ مغرب قریبِ انجام است — کشائے چشم کہ وقتِ طلوعِ اسلام است

اساسِ بامِ فلک بوس اینقدر خام است — کہ ضعفِ بام بقدرِ بلندیٔ بام است

"ہر آنکہ محرمِ بادِ صبا ست می داند" — کدام سمت روانیٔ دورِ ایّام است

مباش منتظرِ عشوہ و کرشمۂ خاص — نگاہ کُن بہ جمالے کہ جلوہ اش عام است

دلِ زبونِ تو گر در خورِ نگاہش نیست — مگو کہ عشق بہ مقصودِ خویش ناکام است

کجا بود دگراں را امیدِ آزادی — اگر کبوترِ بامِ حرم تہِ دام است

شرابِ ناب بخواہی؟ زِ شاخِ تاک بگیر

مخور فریبِ مئے لالہ گوں کہ در جام است

سلیم کے نام..... دوسرا خط

(از جناب چوہدری غلام احمد صاحب پرویز بی اے)

سلیم! تم دُرست کہتے ہو کہ جمعۃ الوداع کے دن جامع مسجد میں قریب پچاس ہزار مسلمانوں کا اجتماع ہوگا۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ اور تم نے یہ بھی ٹھیک کہا کہ اس عظیم الشان گروہ کے ایک آواز پر جھکنے اور اُٹھنے کی ہم آہنگی کا نظارہ بڑا دلکش تھا۔ اس کی دلکشی تو اس سے بھی ظاہر ہے۔ کہ بڑے بڑے سیاح آپکے اس "تماشے" کی تصویریں لینے دُور دُور سے آتے ہیں اور اُنکے لیئے مسجد کے سب سے بلند مقام پر اُن حضرات کی طرف سے سہولتوں کے سامان بہم پہنچائے جاتے ہیں۔ جنسے اگر تصویر کشی کے متعلق فتوے طلب کیا جائے تو کبھی تکفیر سے ورے بات نہ کریں۔ یہ تو تھا جملہ معترضہ۔ لیکن سلیم! میں پوچھتا ہوں کہ مسلمانوں کے اسقدر ہجوم میں کتنے انسان تھے کہ جسمانی حرکات کی ہم آہنگی کے ساتھ اُنکے قلوب بھی ہم آہنگ ہوں۔ اسلام وحدتِ خیالی کے بعد۔ کہ جسے اصطلاح میں ایمان کہا جاتا ہے۔ وحدت فی العمل کا سبق سکھانے آیا تھا۔ اور اس اتحادِ عمل بلکہ ائتلافِ خیال و عمل کے بہترین مظاہرے اسی قسم کے اجتماعات تھے۔ لیکن ذرا غور کرکے بتاؤ تو سہی کہ اس ظاہری اتحادِ عمل میں حقیقی اتحاد خیال و اعمال کا جذبہ کس حد تک کارفرما تھا۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ مولوی صاحبان صف بہ صف۔ اِدھر اُدھر لوگوں کو نماز باجماعت کے مسئلے بتاتے پھرتے تھے۔ وہ سمجھاتے تھے کہ صفیں کس طرح سیدھی رکھنی چاہئیں۔ دونوں پاؤں کے درمیان فاصلہ کسقدر ہونا چاہیئے۔ کندھے کے ساتھ کندھا نہ ملنے سے کتنا عذاب ہوگا۔ پہلی صف میں بیٹھنے سے کسقدر ثواب ہوگا۔ لیکن سلیم! ان میں سے کسی ایک نے یہ بھی بتایا کہ مسلمانو! تم یہاں جمع کس غرض کے لیئے ہو؟ تمہیں نماز کیا پیغام دیتی ہے؟ جماعت کے ساتھ ملنا کیوں ضروری ہے؟ یہ اُٹھنا۔ بیٹھنا کیسا ہے! صفیں کیوں سیدھی ہونی چاہئیں! امام صرف ایک ہی کیوں ہوتا ہے! اور اسکی ایک آواز پر بلا چوں وچرا سب کو ایک ہی حرکت کیوں کرنی

پڑتی ہے! وہ غلطی کرتا ہے تو اس کی غلط متا بعت اسوقت کیوں ضروری ہوتی ہے! ایک وقت میں ایک ہی جماعت کیوں ہوتی ہے۔ متعدد جماعتیں کیوں نہیں ہوسکتیں؟ تماشا دیکھنے والے سیاح جب اس نظارہ کو اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہیں تو مسلمانوں کے ضبط و انضباط۔ اس وحدتِ فی الخیال والعمل۔ اس یک نگہی اور ہم آہنگی۔ اِس اطاعت۔ وتمسک بالجماعت کی بے حد تعریف کرتے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ اِس حقیقت سے وہ بھی آشنا ہوچکے ہیں کہ یہ سب مظاہرہ اب صرف جسموں تک ہی محدود ہوچکا ہے۔ قلوب پر اسکا کچھ اثر نہیں۔ یہ ایک رسم بنکے رہ گیا ہے۔ اس کی رُوح بالکل بھلائی جاچکی ہے۔ آج دُنیا کی ہر قوم اپنی تمام قوت اِس بات کے لیے صرف کررہی ہے کہ اُنکے افراد میں اتحادِ خیال و وحدتِ عمل پیدا ہو۔ اُنکے قلب و نگاہ میں یک جہتی اور ان کی حرکات و سکنات میں یگانگت پیدا ہوجائے۔ وہ ایک "امام متفق علیہ" کی آواز پر سب کے سب جُھک جائیں۔ اور سب کے سب اُٹھ کھڑے ہوں اب اندازہ لگاؤ کہ جس قوم میں یہ سب چیزیں بلامحنت و کاوش خود بخود موجود ہوں۔ اور اس سے نتیجہ کچھ برآمد نہ ہو۔ تو اُسے تم بے روح مظاہرہ نہ کہوگے تو اور کیا کہوگے۔ اور پھر یہ بھی دیکھو کہ یہ دُنیا ضبط و انضباط تلاش کررہی ہے محض اسلیئے کہ اِس انداز سے اپنے اندر قوت پیدا کرکے اپنی ستم کوشیوں کی تشنگی کمزوروں کے خونِ ناحق سے بجُھائے۔ لیکن ملّتِ اسلامیہ میں یہ سب کچھ اسلیئے پیدا کیا جاتا ہے کہ انکے قلوب مزکّی ہوں۔ اُن کی رُوح میں بالیدگی آئے وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کو سامنے رکھیں۔ انکا جھکنا ہو تو اُسکے لیئے، اٹھنا ہو تو اسکے لیئے۔ اُن کی قوت ناتوانوں کی حفاظت کے لیئے ہو۔ انکی طاقت ضعیفوں کے حقوق کی نگہداشت کرے۔ وہ اپنے ایمان و اعمال صالح سے ایسی قوت پیدا کریں کہ استخلاف فی الارض کی نعمتِ کبریٰ سے نوازے جائیں۔ اور اس استخلاف سے مقصود ملوکیت نہ ہو۔ بلکہ اِس دنیا میں خدا کی بادشاہت کا قیام ہو۔ ضابطۂ خداوندی کی تنفیذ و ترویج ہو۔ سلیم اندازہ لگاؤ کہ رمضان کا آخری جمعہ۔ اِن مقاصدِ عالیہ کے حصول کے لیئے کس قدر عظیم المرتبت نفسیاتی کیفیتیں اپنے اندر رکھتا ہے مہینہ بھر سے خدا کے بندوں میں جسمانی اور روحانی انقلاب پیدا کیا جارہا تھا۔ انہیں ٹھیٹھ سپاہیانہ زندگی کا خوگر بنایا جارہا تھا۔ انکے دلوں کو تمام خباثتوں سے پاک اور انکی

نگاہوں کو تمام خباثتوں سے مرکّی بنایا جا رہا تھا۔ ان سے حلال وطیب چیزیں بھی چھڑائی گئی تھیں کہ انکا ذہن کبھی حرام وخبیث چیزوں کی طرف توجہ بھی نہ کرے۔ اِسکے بعد انھیں ایک جگہ جمع کیا گیا کہ وہ جائزہ لیں اپنے تمام اعمال کا۔ اور محاسبہ کریں اس انقلاب کا جو اُنکے اندر پیدا ہوا ہے۔ اپنی انفرادی خودی جسکا یوں استحکام کرایا گیا ہے، اسے آکر ایک اجتماعی کُل میں جذب کردیں۔ اور یوں اطاعتِ امیر۔ مرکزیت۔ ایثار۔ تمسک بالجماعت۔ اتحادِ عمل۔ ائتلاف خیالات کے جیتے جاگتے مظاہرے سے تجدیدِ عہدِ وفا کریں۔ اور اُٹھتے اور جھکتے بار بار اس آقائے حقیقی کے سامنے اِس بات کی عملی شہادت پیش کریں کہ :۔

اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ۔ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ۔ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ۝

میری نماز اور میری قربانیاں۔ میرا جینا میرا مرنا۔ سب اللہ رب العالمین کے لیئے ہے

سلیم! تم سمجھتے ہو کہ مزکّی ومقدس نفوس کی یہ جماعت دُنیا میں کیا کچھ نہ کرسکتی ہوگی۔ لیکن ذرا یکمرتبہ اِس ہجوم مومنین کی نماز پر پھر ایک نگاہ ڈالو۔ ساری نماز پر نہیں۔ نماز کے صرف ایک ٹکڑے پر۔ ذرا اندازہ لگاؤ کہ پچاس ساٹھ ہزار انسانوں کا گروہ۔ اپنے اللہ کے سامنے رُوبہ قبلہ مسجد میں کھڑے۔ یہ اقرار کر رہا ہو کہ :۔

اِیَّاکَ نَعْبُدُ

اے اللہ! ہم صرف تیری محکومیت کو جائز سمجھتے ہیں۔ اِسکے علاوہ ہر قسم کی غلامی کا طوق ہم پر حرام ہے لیکن زبان سے یہ الفاظ ادا کر رہا ہو اور دماغ سینکڑوں خداؤں کا تبکدہ بن رہا ہو۔ تو اِس دعوے کو تم خدا فریبی۔ اور خود فریبی نہ کہوگے تو اور کیا سمجھوگے ؟ اب اگر کوئی یہ کہہ دے کہ ان لوگوں نے نماز نہیں پڑھی اپنے آپ سے غدّاری اور خدا سے دھوکہ کیا ہے تو مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک کے "حاملانِ دینِ متین" لٹھ لیکر اسکے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ اور اسمیں یہ بیچارے بھی معذور ہیں۔ اسلیئے کہ انہیں بتایا ہی یہ گیا ہے کہ اگر ہاتھ فلاں مقام پر باندھ لیئے جائیں۔ پاؤں میں اتنا فاصلہ رکھ لیا جائے۔ اُنگلیوں کا رُخ فلاں سمت کو ہو۔ سجدے میں فلاں فلاں حصّے پہلے زمین بوس ہوں۔

الفاظ اپنے صحیح مخرج سے نکلیں، تو نماز ہو جاتی ہے۔ اور جب پوچھو کہ اس بات کی کیا سند کہ اِس سے نماز واقعی ہو جاتی ہے، تو جواب ملجاتا ہے کہ اِسکا علم تو قیامت ہی کو ہو گا کہ دُنیا دارالعمل ہے۔ جزا یہاں نہیں مل سکتی۔ اِسلیئے پتہ بھی یہاں نہیں لگ سکتا۔ اور جب اُن سے کہو کہ بھائی اللہ تعالیٰ تو ایمان و عمل کی جزا، استخلاف فی الارض اور وراثتِ زمین فرماتا ہے، تو کہہ دیتے ہیں کہ اِس ارض سے مُراد جنت کی زمین ہے۔ لیکن سلیم! ان باتوں کو تم کسی سے نہ پوچھو۔ قرآنِ کریم تمہارے سامنے ہے۔ انسانیت کے معراجِ کبریٰ کے دورِ ہمایوں کی تاریخ تمہارے پاس ہے ان چیزوں کو دیکھو اور پھر

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

تمہیں معلوم ہے کہ ۲ھ میں روزے فرض ہوئے۔ اور اسی رمضان کی ۱۷ تاریخ کو ان روزہ دار نمازیوں کی قوتوں کا امتحان بھی لے لیا گیا۔ یُورپین مؤرخ کہتے ہیں کہ واٹرلو کی لڑائی نے یُورپ کی تاریخ کا نقشہ بدلدیا۔ لیکن اُن کی تنگ نگاہیں ذرا اور آگے بڑھتیں تو دیکھتیں کہ ۲ھ کے رمضان میں بدر کے میدان میں جو لڑائی ہوئی اُسنے دُنیا کی ہسٹری کو بدلدیا۔ باطل و ظلمت کی تمام قوتیں اپنے ساز و سامان سے آراستہ اِس ارادے سے میدان میں نکل آئیں کہ (معاذ اللہ) اللہ کے نُور کو دُنیا سے مٹادیا جائے۔ مسلمانوں کی کل کائنات، قریب تین نفوس، جو ابھی ابھی اپنا گھر بار چھوڑ کر دوسروں کے ہاں پناہ گزین ہوئے تھے۔ بے سر و سامان۔ بظاہر بے کس و بے بس۔ اُنکے لیئے اب زندگی اور موت کا سوال تھا۔ نہیں حق و باطل کے غلبہ کا سوال تھا۔ ان روزہ داروں نے کیا کیا؟ اپنے بچوں تک کو لے کر، کھجوروں کی ٹہنیوں اور اونٹوں کی پسلیوں سے مسلح۔ میدانِ جہاد میں آگئے۔ سلیم! ذرا اسموقع کی نزاکت کا اندازہ لگاؤ اور اسکا احساس اِس سے کرو کہ خود نبی اکرمؐ نے اِس لق و دق صحرا میں نہایت خشوع و خضوع سے اپنے رب کو پکارا اور کہا کہ اے اللہ! تیرے بندوں کی یہ مٹھی بھر جماعت محض تیرے نام کی بلندی اور تیرے پیام کی حفاظت کو لیئے سربکف اِس میدان میں جمع ہو گئی ہے اگر آج یہ سب شہید ہو گئے تو دُنیا میں تیرا نام لینے والا کوئی نہیں رہے گا۔ مانگنے والے نے ابھی اپنی دُعا بھی ختم نہیں کی تھی کہ دینے والے نے اسے اپنی رحمتوں سے یوں نوازا کہ:-

انی ممدکم بالف من الملائکۃ مردفین ۝

میں تمہاری مدد کے لیے ہزار فرشتے لگاتار بھیجونگا۔ فرشتے تمہاری مدد کے لیے آئینگے اور وہ آکر کیا کرینگے ؟

فَثَبِّتُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔ سَاُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ کَفَرُوا الرُّعْبَ

مسلمانوں کے دلوں کو مضبوط رکھو۔ میں کفار کے دلوں میں تمہاری دہشت طاری کردونگا

فی الحقیقت وہ ملائکہ جنھوں نے خلیفۂ فی الارض کو جھک کر سلام کیا تھا۔ انھیں یونہی مدد کرنی چاہیئے تھی لیکن سلیم! اللہ تعالےٰ نے یہی نہیں کہہ دیا کہ تم مزے سے بیٹھے رہو۔ سب کچھ ہمارے فرشتے ہی کردینگے۔ بلکہ اس وقت ایک مکمل ضابطہ سامنے رکھ دیا کہ تمہیں کیا کرنا ہے، ذرا غور سے سنو کہ وہ ضابطہ کیا ہے، و ہدایات کس قسم کی ہیں۔ فرمایا:۔

"اے ایمان والو! جب تم میدانِ جنگ میں کفار کے سامنے جاؤ تو انکو پیٹھ مت دکھاؤ۔ یاد رکھو۔ جو آج کے دن پیٹھ دکھائیگا۔ اِلّا اِس بات کے وہ پینترا بدلتا ہوا یا اپنی فوج میں آنے کے لیے ایسا کرتا ہو۔ اسپر اللہ کا غضب ہوگا۔ اور اُسکا ٹھکانہ جہنم ہوگا اور وہ بہت بُرا ٹھکانہ ہے۔

سلیم! سُنتے ہو کہ مخاطب کون سے مسلمان ہیں اور غور کرتے ہو کہ اپنی قوم کا ساتھ چھوڑ دینا دشمن کے مقابلہ میں پیٹھ دکھا دینا کسقدر جُرمِ عظیم ہے۔

پھر فرمایا:۔

"اے ایمان والو! اللہ کی اور اسکے رسول کی اطاعت کرو۔ اور اس سے مت پھرو۔ درانحالیکہ تم سُن رہے ہو۔ اور ان لوگوں کی طرح مت ہوجانا۔ جنہوں نے کہہ دیا کہ ہم نے سُن لیا۔ حالانکہ وہ (صحیح معنوں میں) سُنتے نہ تھے۔ اے مسلمانو! اللہ اور اسکے رسول کی آواز پر لبیک کہو۔ جسوقت وہ تمہیں اِس چیز کی طرف بُلائے جو زندگی بخشنے والی ہے۔

سمجھتے ہو کہ خدا کی راہ میں "مرجانے" کا نام زندگی کیوں رکھا جاتا ہے ؟ اِس عظیم الشان حقیقت پر غور کرو۔

موت اور حیات کے سربستہ راز تم پر منکشف ہو جائینگے۔ اور پھر اس اطاعت پر بھی غور کیا جس میں سُننا شرط ہے۔ یہ بالمشافہ اطاعت زندہ مرکز کی اطاعت نہیں تو اور کیا ہے۔

پھر فرمایا:۔

"اے مسلمانو! جب تم کسی جماعت کے مقابلہ میں جاؤ تو ثابت قدم رہو۔ اور اللہ کو شدت سے یاد کرو۔ تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ اور اللہ کی اور اُسکے رسول کی اطاعت کرو۔ اور آپس میں مت جھگڑو۔ ورنہ تمہارے حوصلے پست ہو جائینگے۔ تمہاری ہوا اُکھڑ جائیگی۔ ثابت قدم رہو۔ اللہ ایسے ہی لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے"۔

سلیم! سُنتے ہو کہ یہ ہدایات کیا ہیں! یہ زندگی کا پیغام ہیں۔ یہ اسلام کی رُوح ہیں۔ یہ ایک عبدِ مومن کے اظہارِ عبودیت کا حقیقی مفہوم ہیں۔ یہ صرف ۲ ھ کے بدر موقع کے وقتی احکام نہیں۔ بلکہ قیامت تک۔ جب تک حق و باطل میں آویزش کا امکان ہے۔ جب تک خیر و شر کا مقابلہ ہے۔ جب تک شرارِ بولہبی چراغِ مصطفوی سے ستیزہ کار ہے۔ اسوقت تک کے لیئے۔ تمام مسلمانانِ عالم کے واسطے ایک دستورِ اساسی ہے ایک لائحہ عمل ہے۔ یہی ہدایات ہیں جنکے لیئے رمضان کے روزے اور اُن روزوں کا جمعۃ الوداع ہے

سلیم! اب تم خود فیصلہ کرو کہ صحیح نتائج پیدا کرنے والے اِن تین سو مسلمانوں کے روزے اور نمازیں تھیں۔ یا اِس ساٹھ ستر ہزار کا رسمی اجتماع کہ جس میں مقصدِ روح کی طرف کسی کی توجہ نہ ہو سو بھائی! نادان کیوں بنتے ہو! کیا تم اتنی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتے کہ سحری اور افطاری کے گولے قلعہ کی دیواریں نہیں ڈھا سکتے ہر چند اُنکا دھماکا اور دُھواں اصلی گولوں ہی کا سا ہوتا ہے۔

عید کے متعلق میں نے تمہیں پچھلے سال بتایا تھا کہ یہ نزولِ قرآنِ کریم کی یاد میں اسلامی جشن ہے تم دُنیا بھر کی قوموں کے مختلف جشن و مسرت کے تیوہاروں کو دیکھو۔ اُن میں یا تو کسی انسان کی یادگار کا جذبہ پنہاں ہوگا۔ یا مظاہرِ فطرت کی نیرنگیوں کی تقریب۔ یا نئے موسم کا استقبال لیکن تم سمجھتے ہو کہ انسانوں کی یادگاریں مِٹ سکتی ہیں۔ دُنیاوی واقعات بھلائے جاسکتے ہیں، تاریخ کے

صفحات گم ہو سکتے ہیں۔ بڑی بڑی چٹانوں پر گاڑی ہوئی لاٹھیں اور ان لاٹھوں پر کندہ کی ہوئی داستانیں۔ زلزلے کے ہاتھوں تباہ ہو سکتی ہیں لیکن خدا کے آخری رسولؐ کا وہ ازلی و ابدی پیغام جو قرآن کی دفتین میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔ کبھی مٹ نہیں سکتا کہ اُس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اُسنے لے لی ہے جو زندہ ہے کبھی مر نہیں سکتا جو قائم ہے کبھی فنا نہیں ہو سکتا۔ وہ باقی ہے وہ زندہ ہے اسکا کلام بھی زندہ ہے یہ جشنِ عید اسی خُدائے حی و قیوم کے زندہ قرآن کے نزول کی یادگار میں ہے۔ اور جب تک دُنیا رہے گی۔ یہ یادگاریں باقی رہیں گی۔ اللہ اکبر۔ لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ۔ وَاللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ وللہ الحمد۔

پھر جس طرح یہ کتاب دُنیا کی کتابوں سے عجیب تر ہے۔ اس کی یاد بھی دُنیا کی تمام یادگاروں سے نرالی ہے۔ دُنیا کے جشن کھیل تماشے، رنگ رَاگ عیش و نشاط سے منائے جاتے ہیں لیکن شعائر الٰہی کی یادگاروں کے جشن منانے کے لیئے ایک بالکل الگ پروگرام تجویز کیا گیا ہے اسکے لیئے مہینہ بھر سے لوگ تیار کیئے جا رہے تھے۔ اُنہیں سکھایا جا رہا تھا۔ کہ دُنیا کی تمام جھوٹی طاقتوں سے منہ موڑ کر اس ایک خدا کے غلام بنجاؤ۔ مانگو تو اسی سے مانگو جھکو تو اسی کے سامنے جھکو بھوکے اور پیاسے رہ کر اپنے فرائض سرانجام دو۔ یہ ایک ٹریننگ تھی جو سپاہی کو میدان میں لانے سے پیشتر دی جاتی ہے۔ پُورے ایک مہینے کی ریاضت و محنت سے قلوب میں تقویٰ پیدا کرو تو اُنہیں ایک جگہ جمع ہونے کا حکم دیا کہ نیک دِل اور پاکیزہ دماغ لے کر سر جوڑ کر بیٹھیں، اور سوچیں کہ ہمیں اِس امتیازی زندگی کے حصول و استبقاء کے لیئے کیا کچھ کرنا ہے، جو مومنین کی خصوصیت ہے اور جسکا وعدہ قرآن کریم میں موجود ہے۔

سلیم! اسلام رہبانیت کا مذہب نہیں۔ دنیا تیاگ دینا۔ زیب و زینت سے نفرت کرنا ہنسی خوشی سے بیزار ہو کر "عبوسًا قمطریرًا" بنجانا۔ یہ اسلام نہیں سکھاتا۔ اِس فیشن میں عمدہ کپڑے پہننے سے، اچھے اچھے کھانے پکانے سے۔ دوستوں کو تحائف دینے سے۔ بچوں کے لیئے خوشی اور مسرت کے سامان بہم پہنچانے سے۔ اسنے نہیں روکا لیکن اسلام جس طرح دُنیا کی ہر مصیبت کے وقت خدا کی یاد کو سامنے لے آتا ہے۔ اسی طرح وہ ہر آسائش اور مسرت کی تقریب پر خدا کے محتاج و مفلس بندوں کو

بھی نہیں بھلاتا۔ اسلیئے اُسنے کہا ہے کہ جب تم اپنے اور اپنے بچّوں کے لیئے سامانِ آسائش و مسرت بہم پہنچانے لگو۔ تو سب سے پہلے یہ دیکھو کہ غریب اور نادار لوگوں کی مسرت کا کیا انتظام ہے۔ پہلے اُنکی خوشی کا سامان کرو۔ پھر جشنِ یادگار میں آؤ۔ کہ جب تک قوم کے تمام افراد جشن میں شریک نہ ہونگے جشن مکمل نہ ہوگا۔ تمہاری خوشی اسی میں ہے کہ ساری قوم خوش ہو، تمہاری بڑائی اسی میں ہے کہ ساری قوم بڑی ہو،

سلیم! تمہیں کیا معلوم کہ قوم کی حالت کیا ہے؟ اِسکا اندازہ اس سے مت لگاؤ کہ تمہارے سامنے نئے نئے کپڑے پہننے والے مسلمانوں کا اجتماع ہے! قوم کی حالت کا اندازہ لگانا ہو تو جاؤ ان گھروں کے اندر جہاں سے یہ نئے نئے کپڑوں والے مسلمان باہر آئے ہیں۔ اور دیکھو کہ کتنے گھر ہیں کہ جن میں مٹکے اور ٹھلیاں اوندھی پڑی ہیں۔ کہ کئی دنوں سے اِن میں آٹا نہیں پڑا۔ دیکھو کہ کتنے چولھے ہیں جن میں مکڑی نے جالا تن رکھا ہے کہ کئی وقت سے ان میں آگ نہیں جلی۔ دیکھو کہ کتنی شریف عورتیں ضرورت کے لیئے گھروں سے باہر نہیں آسکتیں کہ اُنکے سر پر چادر نہیں ہے۔ دیکھو کہ کتنے بچے اور بوڑھے رات بھر الاؤ کے گرد بیٹھے رہتے ہیں کہ اس سردی میں اُنکے پاس اوڑھنے کو لحاف نہیں۔ دیکھو کہ کتنے جوان مریض موت کے منہ میں کھنچے چلے جا رہے ہیں کہ ان کی دوائی کے لیئے گھر میں پیسہ نہیں۔ سردی۔ بھوک۔ محتاجی اور بربادی کے اِن ہولناک مناظر کو دیکھو اور پھر اندازہ لگاؤ کہ قوم کی کیا حالت ہے؟ اور اگر تمہارے سینے میں دِل اور دل میں احساس کی کوئی رمق باقی ہے، تو پھر سوچو کہ آج یہ تمہارا جشنِ مسرت کا جشن ہے یا بربادی کا ماتم! سلیم! میں جانتا ہوں کہ خوشی کے موقع پر مصیبتوں اور تکلیفوں کی یاد بدشگونی خیال کی جاتی ہے۔ آج جس دور سے ہم گزر رہے ہیں۔ اس میں خوشی کو خوشی سمجھنا۔ خود اپنے آپ کو فریب دینا ہے۔ قوم کی حالت یہ ہے لیکن سلیم! جانتے ہو کہ قوم کے راہ نما، شریعتِ مقدسہ کے علمبردار ان۔ کون سے اہم مسائل کے حل دریافت کرنے میں مصروفِ جہاد ہیں؟ اگر تم یہ جاننا چاہو تو دہلی سے شائع ہونے والے اخبار "محمدی" اور امرتسر سے شائع ہونے اخبار "اہلحدیث" کے اکتوبر۔ نومبر کے پرچے اُٹھا کر دیکھو، ان میں اس مسئلہ جلیلہ پر گرما گرم بحث چل رہی ہے کہ لڑکے اور لڑکی کے ختنے کی دعوت قبول کرنا جائز ہے یا نہیں اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ اور یہ دونوں اخبار

اس جماعت کے ترجمان ہیں جسکے اسلاف میں ہمیں سیّد احمدؒ بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید علیہ الرحمۃ کے درخشندہ اسمائے گرامی ملتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جب ترکوں نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا ہے۔ اور انکی فوجیں شہر کی چاردیواری تک آپہنچی ہیں تو شہر کے اندر پادریوں کی سب سے بڑی مجلس چالیس دن سے اِس مسئلہ پر بحث کر رہی تھی کہ حضرت عیسٰے پر جو مائدہ نازل ہوا تھا اس میں روٹی خمیری تھی یا خطیری۔ مسلمان ان واقعات کو پڑھتے ہیں اور تحقیر کی ہنسی ہنس دیتے ہیں۔ لیکن نہیں سوچتے کہ خود انکے اپنے گھر میں کیا ہو رہا ہے۔

سلیم! اب تمہاری آخری بات کا جواب رہ گیا کہ جب ہمارے اِن اجتماعات میں آج وہ رُوح اور مقصد نہیں رہا تو ہمیں پھر اُن کی پابندی اور ان کو قائم رکھنے کی کیوں اسقدر شدّت سے تاکید کرتا رہتا ہوں عزیزم! یہ اسلیئے کہ جیسا کہ میں کئی بار لکھ چکا ہوں، ہماری فلاح وسعادت انہی مناسک شعائر کی راہ سے آئے گی۔ اور اِس سعادت کے بعد ہماری شوکت وعظمت کے قیام کے ضامن بھی یہی مناسک اجتماعات ہونگے، سو آج اگر ہماری قرآنِ کریم سے دُوری کے باعث ان میں وہ روح باقی نہیں رہی جو زندہ نتائج کا موجب تھی تو ان کی صورت ضرور باقی رکھنی چاہیئے کہ جب اللہ تعالیٰ ہم پر سے یہ عذاب اٹھالیگا جس میں ہم ایک مُدّت سے مبتلا ہیں۔ تو اسی قالب میں روح آجائیگی۔ اور پھر یہ چلتا پھرتا جیتا جاگتا انسان بنجائیگا اگر روح پہلے مِٹ چکی تھی۔ اور صورت کو ہم اب مٹا دیں تو پھر ہماری نشاۃ ثانیہ کی کوئی اُمید باقی نہیں رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ عید کی نماز کے بعد میں نے تمہیں خاموش بیٹھنے کی تاکید کی تھی۔ اگرچہ خطیب کا ایک لفظ بھی تمہارے کانوں تک نہیں پہنچ سکتا تھا اور اگر پہنچتا بھی تو اس سے تمہیں کچھ فائدہ نہ تھا کہ وہ عربی میں تھا اور تم عربی جانتے نہ تھے۔ اور اگر جانتے بھی ہوتے تو بھی اس میں تمہیں مسائل حاضرہ کے متعلق کوئی چیز نہ مل سکتی، کہ اِنکے نزدیک تو خطبہ ایک رسم شرعی ہے جس کی ادائیگی سے "ثواب" ہوتا ہے۔ باقی رہا یہ کہ لوگوں نے اسقدر بھاگم دَوڑ کیوں شروع کر رکھی تھی سو اسکا جواب مجھ سے نہیں ان مولوی صاحبان سے پوچھو جو اپنی ذاتی آواز کو دُور تک پہنچانے کے لیئے ٹیلیفون کا استعمال بالکل جائز سمجھتے ہیں۔ لیکن بہ حیثیت خطیب و امام اپنی آواز کو دُور تک پہنچانے کے لیئے آلۂ مکبر الصوت کا استعمال حرام قرار دیتے

ہیں۔ اور تمہیں معلوم ہے کہ اس نتیجہ پر پہنچنے کے لیے ہمارے اِن "مفتیانِ کرام" کے پاس ذرائع کیا ہیں۔ مکبر الصوت (Loud Speaker) کی حلت و حرمت کے متعلق فیصلہ کرنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ معلوم کیا جاتا کہ اس آلہ کی ماہیت کیا ہے اور جو آواز سامعین تک پہنچتی ہے، وہ واقعی متکلم کی آواز ہوتی ہے یا کوئی اور۔ اب سُنیئے کہ یہ تحقیق کن ذرائع سے ہوئی ہے۔ ہمارے دینی مرکز یعنی دارالعلوم دیوبند کے مفتی۔ جناب مولانا محمد شفیع صاحب نے ان فتاویٰ کا ایک مجموعہ شائع فرمایا ہے جن میں "عباداتِ مقصودہ" کے لیے اس آلہ کی حرمت کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اس رسالہ (البلائع المفیدہ[1] فی حکم الصنائع الجدیدہ) کے صفحہ ۲۰ پر درج ہے کہ الگزنڈر ہائی اسکول بھوپال۔ کے سائنس ماسٹر جناب برج نندن لال صاحب سے دریافت کیا گیا اور وہ فرماتے ہیں کہ "برقی قوت کی وجہ سے ہیں تو کم ازکم یہ ماننے میں تامل کرتا ہوں کہ اصل آواز ہے اور اسکا انکار بھی مجھ سے ممکن نہیں کہ ثبوت مشکل ہے" یہ ہے منجملہ ذرائع تحقیق ہمارے ان مفتیانِ کرام کے جن کی بنا پر حلت و حرمت کے فیصلے صادر ہوتے ہیں۔ اور یہ حضرات ان اسلاف کے جانشین ہونے کے مُدعی ہیں۔ جنکے متعلق قرآن کریم نے فرمایا وسخر لکم مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَمِیْعًا۔ (زمین و آسمان میں جو کچھ ہے۔ سب تمہارے تابع فرمان ہے) اب سلیم! تم خود سمجھ جاؤ گے کہ ہم کہاں ہیں اور قرآن کریم ہمیں کہاں لے جانا چاہتا تھا۔

والسّلام!

پرویز

---

[1] نام سے نہ گھبرایئے رسالہ اُردو میں ہے

ہندوؤں مسلمانوں کی مشترکہ دلچسپیاں

(جناب محمد اکرم خاں صاحب مدیر روزنامہ شمس ملتان)

اگر کسی مُلک میں ایک سے زیادہ قومیں آباد ہوں تو خوشگوار تعلقات قائم رکھنے اور صلح و امن کی زندگی بسر کرنے کے لیے باہمی میل جول اور بہت سے معاملات میں تعاون اور اشتراک عمل نہایت ضروری ہوتا ہے۔ چنانچہ ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو انتظامی۔ سیاسی۔ کاروباری اور معاشرتی اُمور میں مل جُلکر کام کرنا پڑتا ہے۔ اس قسم کی اکثر ضروریات تو ایسی ہوتی ہیں جنہیں اشتراکِ عمل ناگزیر ہوتا ہے، جیسے مُلازمت میں۔ تجارتی کاروبار میں کمیٹیوں اور کونسلوں میں لیکن اس لازمی اشتراک کے علاوہ آپس کے میل جول سے خود بخود بہت سی ایسی مشترکہ دلچسپیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ جن میں دونوں اپنی خوشی سے برابر حصّہ لیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مجبوری کے اشتراک کے بہ نسبت یہ رضامندانہ تعاون زیادہ قابلِ قدر ہے۔

ان مشترکہ دلچسپیوں میں غالباً سب سے دیرینہ وہ "رُوحانی" مشاغل ہیں جو ہندوؤں میں یوگ اور مسلمانوں میں تصوف کے نام سے رواج پا چکے ہیں، جہاں تک اسلامی تصوف شریعت کی حدود کے اندر رہ کر صلح کل مسلک کی تلقین کرتا ہے۔ اُس سے قطع نظر بعض باتوں میں مسلمان صوفی ان حدود سے نکلکر ہندو یوگیوں کے ساتھ دستِ تعاون بڑھاتے ہیں۔ اور مذاہب کی حد بندیوں سے بالاتر ہو کر بزعم خود وحدتِ انسانی کی طرف قدم اٹھاتے ہیں۔ اس فلسفہ کے عملی نتیجے ہماری معاشرت میں مختلف صورتوں سے نمایاں ہیں۔ ہندو یوگیوں کے مسلمان چیلے اور مسلمان پیروں کے ہندو مُرید۔ عُرسوں اور قوالی کی مجالس میں ہندوؤں کی شرکت اور مسلمان فقراء کا ہندوانہ لباس وغیرہ اس کی عام مثالیں ہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ بعض اکابر جو ہندوؤں اور مسلمانوں کی متحدہ قومیت کو نصب العین بنا چکے ہیں۔

تصوف کے اندر کامیابی کی ایک جھلک محسوس کرتے ہیں۔

اِن روحانی مشاغل کے بعد دوسرے درجے پر وہ میلے آتے ہیں۔ جن میں دونوں قوموں کے افراد بلا امتیاز شریک ہوتے رہتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں اِن مشترکہ دلچسپیوں کی فہرست میں سیاسی پارٹیوں اور ادبی مجلسوں کا بھی اضافہ ہوگیا ہے۔ مشاعروں جیسی ادبی مجالس پہلے زمانہ میں بھی مختلف قوموں کو یکجا کر دیا کرتی تھیں لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے یہ میل جول محض معاشرتی اور خالص ادبی ہوتا تھا۔ لیکن آج کل اس کی تہ میں سیاسی مقاصد کارفرما ہوتے ہیں۔ بالخصوص جب سے ہندوستان کی سیاسی فضا میں متحدہ قومیت کا تصوّر پھیلایا گیا ہے، اِن مشترکہ دلچسپیوں کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے۔ ہمارے بہت سے سیاسی رہنماؤں کا یہ ایک عام مشغلہ ہوگیا ہے۔ کہ اِس امر پر غور کیے بغیر کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی "وحدتِ قومی" فی الحقیقت کیا مفہوم رکھتی ہے۔ اور یہ کس حد تک قابلِ عمل ہے، جا و بیجا ہر موقع پر اس کی تبلیغ کرتے رہتے ہیں۔ جس معاملہ میں بھی ہندو اور مسلمان کسی قسم کا اشتراکِ عمل کریں۔ یہ سیاسی رہنما اُسے اتحاد قرار دیکر اظہارِ مسرت کیے بغیر نہیں رہتے +

میدانِ سیاسیات میں ایسے اتحاد کی تبلیغ ذرا ہمّت طلب ہوتی ہے اور بعض اوقات اِس دعوت کے عملی نتائج مشکلات اور خطرات کا موجب بھی ہو جاتے ہیں۔ اسلیئے ایسے محتاط حضرات جو اس خارزار میں قدم رکھنے کی جرأت نہیں کرسکتے۔ اس دعوت و تبلیغ کے لیئے دوسرے میدان تلاش کرتے ہیں چنانچہ اس مقصد کے لیئے سب سے بہتر زبان اور ادب کا میدان ملتا ہے۔ بہت سے اکابر کا معمول ہے۔ کہ جہاں کہیں کسی مشاعرے یا ادبی مجلس کی صدارت میسر آئی۔ اسی بات کو سب سے زیادہ نمایاں کیا کہ یہ مشاعرے اور مجلسیں نہایت مبارک اجتماعات ہیں۔ کیونکہ انکے ذریعے مختلف مذاہب کے افراد کو مل بیٹھنے کا موقع ملجاتا ہے۔ اور اُنکے اس مل بیٹھنے سے قومی اتحاد میں ترقی ہوتی ہے۔

اس سلسلہ میں وہ تحریک بھی دلچسپی سے خالی نہیں جو پنجاب کی اتحاد پارٹی کے ایک رُکن نے کچھ عرصے سے شروع کر رکھی ہے۔ یعنی مذہبی تہواروں سے الگ ایک قومی تہوار منایا جائے جس میں سب قوموں کے لوگ شرکت کرسکیں۔ بڑے غور و خوض کے بعد اس مقصد کے لیئے "بسنت" کو منتخب

کیا گیا ہے۔ چنانچہ لاہور میں ہر سال اس موقع پر "اعلیٰ سوسائٹی" کی ایک مشترکہ ضیافت ہوتی ہے ہندو مسلم سکھ عیسائی اکابر سب اس میں شریک ہوتے ہیں۔ اور قومی اتحاد کے اس مظاہرے پر ایک دوسرے کو مبارکباد دے کر کچھ دیر کے لیے دل خوش کر لیتے ہیں۔ یوں تو بسنت پہلے بھی کچھ ہندو مسلمان ملکر منایا کرتے تھے۔ لیکن وہ زیادہ تر "جاہل عوام" ہوتے تھے۔ اب "تعلیمیافتہ خواص" اس تقریب کو نئے زمانہ کے معیار پر منا کر متحدہ قومیت کی بنیادیں مضبوط کرنا چاہتے ہیں۔

اگر معاملہ ادبی مجالس تک رہتا تو خیر ایک بات بھی تھی لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اب یہ سلسلہ اُنسے بھی آگے بڑھنے لگا ہے۔ گزشتہ اکتوبر کے مہینے پنجاب لٹریری لیگ نے لاہور میں دسہرے کا تہوار منانے کے لیے ایک جلسہ منعقد کیا جس میں مہمانِ خاص ایک مشہور ہندو رقاص تھا، جسنے صوبہ جاتِ متحدہ کے ایک پہاڑی مقام پر "ہندوستانی کلچر" کا ایک مرکز کھول رکھا ہے۔ جہاں ہندوستان کے فنِ رقص کو اس کی قدیمی شان کے ساتھ دوبارہ زندہ کرنے کے مقصد کے ساتھ رقص و سرود کی تعلیم دی جاتی ہے، اس "معزز" مہمان کے استقبال کے لیے ہندو مسلمان اور عیسائی اکابر جمع ہوئے اور تینوں قوموں کے نمائندوں نے دل کھول کر اسکی قدر افزائی فرمائی۔ ایک عیسائی رہنما نے تو اس امر پر اظہارِ مسرت کیا کہ رقاص موصوف نے "فنِ رقص میں دُنیا کے نقشے پر ہندوستان کو نمایاں کیا ہے"۔ ایک ہندو بزرگ نے فرمایا کہ "فنونِ لطیفہ دُنیا میں مستقل امن قائم کرنے کا بہترین ذریعہ ہیں ہمیں امن کے سپاہیوں کی ضرورت ہے۔ اور یہ سپاہی ماہرینِ فنونِ لطیفہ ہیں"۔ اسی مجلس میں ملّتِ اسلامیہ کے ایک معزز فرد نے بھی اپنے مخزنِ علم و ادب سے تحسین و آفریں کے چند موتی نچھاور کیے۔ اور حسبِ معمول ارشاد فرمایا کہ "اگر تمام قومیں اہم تقریبات پر باہم مل سکیں تو اُنکے درمیان اچھے تعلقات کا قیام بہت آسان ہو جائے"۔

جہاں تک دوسری قوموں کے اکابر کا تعلق ہے، ہمیں اُنکے نظریات اور طرزِ عمل پر کوئی اعتراض نہیں۔ وہ ادبی مجالس کے پردے میں اپنے مذہبی تہواروں کی شان بڑھانا چاہیں تو چشم ما روشن دلِ ما شاد۔ اگر وہ اپنے قدیم فنِ رقص کو زندہ کرنے میں اپنی قومی ترقی محسوس کرتے ہیں

تو ہمیں اِس سے کچھ بحث نہیں لیکن ہم خود اپنی ملّت کے اکابر سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ آخر یہ قومی اتحاد و اتفاق کا نصب العین کوئی حد و بھی رکھتا ہے یا نہیں ؟ عُرسوں ۔ میلوں ۔ مُشاعروں اور کانفرنسوں سے نکلکر قومی تہواروں تک پہنچے ۔ اور اب مذہبی تہواروں کے ساتھ ساتھ رقص و سرود کی مجالس تک بھی بڑھنے لگے ۔ کیا یہ قومی اتحاد ایسا مقصد ہے، جسے بغیر کسی شرط کے ہر قیمت پر حاصل کرنا ضروری ہے ۔ یا یہ بھی دیکھنا ہے کہ کسی اور مقصد سے تو تصادم نہیں ہوتا ؟

اگر یہ اتحاد بغیر کسی شرط کے مقصود ہے، تو پھر محض فنونِ لطیفہ تک معاملہ کو کیوں محدود کر دیا جائے بہت سی اور صورتیں بھی ہیں جنکے ذریعے مختلف قوموں کے درمیان اشتراکِ عمل کا رشتہ قائم ہو سکتا ہے مثلاً شراب نوشی ایک ایسی چیز ہے ۔ جو تمام اختلافات مٹا کر مختلف مذاہب و اقوام کے افراد کو ہم مشرب و ہم خیال بنا سکتی ہے ۔ لہٰذا شیخ و برہمن کے جھگڑوں اور مسجد و بت خانہ کے بکھیڑوں کو غرقِ مے ناب ہی کیوں نہ کر دیا جائے ؟ میخانے کے علاوہ ناچ گھروں تھیٹروں سینماؤں، قمار خانوں ٹھگوں کی ٹولیوں، اور ڈاکوؤں کے جتھوں بلکہ اُن سب سے بڑھ کر عصمت فروشی کے بازاروں میں اتحادِ قومی کے بہترین نمونے مل سکتے ہیں ۔ جہاں چند مشترکہ اغراض و مقاصد کے پیشِ نظر کسی مذہب ۔ ملّت اور قومیت کی تمیز روا نہیں رکھی جاتی ۔ اگر محض ہندوؤں مسلمانوں کی مشترکہ دلچسپیاں ہی وحدتِ قومی کے مقصدِ بلند کے حصول کا ذریعہ ہیں تو پھر ایسے تمام مشاغل کو یکساں طور پر کیوں نہ سراہا جائے، جن میں سب قوموں کے لوگ ملکر حصّہ لیتے ہیں ؟

لیکن اگر یہ قومی اتفاق مقصود بالذات نہیں ہے اور اسکے حصول پر کچھ پابندیاں عائد کرنا ضروری ہے، تو اس امر پر ضرور غور کرنا پڑیگا کہ خطِ فاصل کس جگہ کھینچا جائے ۔ آپ کہینگے کہ صرف بھلائی کی باتوں میں اشتراکِ عمل کیا جائے، بُرائی کی باتوں میں نہیں ۔ بالکل دُرست ۔ قرآن پاک بھی ہمیں یہی تعلیم دیتا ہے، کہ نیکی اور پرہیزگاری میں تعاون کرو بُرائی اور گناہ میں نہ کرو لیکن یاد رہے کہ جب تک آپ اسلام کی پابندی کا دعوےٰ کرتے ہیں ۔ آپ کو اچھائی یا بُرائی کا معیار بھی اسلامی تعلیم ہی کو رکھنا پڑے گا ۔ یہ نہ ہوسکے گا کہ جو بات آپکے دل کو پسند ہو وہ اچھی اور جو آپ کو ناپسند ہو وہ بُری ٹھہرے ۔

ملّت کے معززاکابرسے نہایت مؤدبانہ گزارش ہے کہ وہ ہندوؤں مسلمانوں کی مشترکہ دلچسپیوں میں ضرور حصہ لیں۔ اور اس طرح دونوں قوموں کے درمیان اچھے تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کریں لیکن اس امر کو کبھی نظر انداز نہ کریں کہ اسلام اُن کو اشتراکِ عمل میں کس حد تک قدم بڑھانے کی اجازت دیتا ہے۔ اس حد کے اندر رہ کر تو اُن کی ہر کوشش مُبارک و مسعود ہوگی لیکن جونہی پاؤں اس حد سے باہر پڑے گا۔ دُنیوی اور اُخروی خُسران کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔

فیصلہ کیا گیا ہے!

کہ طُلوعِ اِسلام میں مہذب اور شائستہ اشتہارات بھی شائع کئے جایا کریں۔ اشاعت کے اعتبار سے یہ رسالہ بفضلِ ایزدی۔ اس پایہ کے رسالوں میں ایک امتیازی درجہ رکھتا ہے۔ اور مُلک کے گوشہ گوشہ میں نہایت بلند طبقہ حضرات کے ہاتھوں میں پہنچتا ہے اسلئے اگر آپ اپنی تجارت کو فروغ دینا چاہتے ہیں تو:۔

طلوعِ اسلام

میں ایماندارانہ انداز کا اشتہار دیجئے!

نرخنامہ و قواعد اشتہار

مقدار	ایک ماہ	۳ ماہ	۶ ماہ	ایک سال
ایک صفحہ	عہ۱۰	عہ۲۵	للعہ۴۵	لہ۸۰
نصف صفحہ	سے	عہ۱۵	عہ۳۵	للعہ۴۵
رُبع صفحہ	للعہ۴	عہ۱۰	معہ۱۷	عہ۲۵

(۱) اشتہارات کی اشاعت سے پہلے اُجرت پیشگی وصول کی جائیگی۔

(۲) صرف وہی چربے قبول کیے جاوینگے جو اس رسالہ کے طرز کے مطابق ہوں

(۳) نرخنامہ میں کوئی ترمیم نہ کی جائیگی۔

(۴) ٹائیٹل کے صفحات پر کوئی بیرونی اشتہار شائع نہ کیا جائے گا۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام بلی ماران دہلی

تبصرہ

افسانۂ پدمنی - چتوڑ کی رانی پدمنی سے سلطان علاء الدین خلجی کے عشق کی داستان ملک محمد جائسی نے اپنی مثنوی "پدماوت" میں لکھ کر اس مسلمان بادشاہ کے اوپر اعتراض کا ایک سبب پیدا کر دیا۔ اور دشمنوں کے ہاتھوں میں مسلمانوں کے خلاف ایک ہتھیار دیدیا۔ مولوی احتشام الدین صاحب ایم اے علیگ دہلوی نے تاریخی روشنی میں نہایت بیّن شہادتوں اور واضح دلیلوں سے اپنی اس کتاب میں یہ ثابت کر کے دکھا دیا کہ اس داستان کی حیثیت واقعہ کی نہیں ہے بلکہ یہ صرف افسانہ ہے۔ یہ دلیلیں اس قدر قوی ہیں کہ ان سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے وجوہات کا بھی کھوج لگانے کی کوشش کی ہے، جنکے باعث یہ افسانہ تراشا جا سکا۔ میرا خیال ہے کہ جو شخص اسکو پڑھے گا وہ بالکل مطمئن ہو جائیگا۔ زبان اور طرزِ بیان نہایت دلکش ہے اور طباعت و کتابت نہایت عمدہ۔ قیمت فی نسخہ عہ ملنے کا پتہ:- کتب خانہ علم و ادب۔ دہلی

کربلا کے بعد - سید عزیز حسن بقائی اڈیٹر رسالہ پیشوا دہلی نے اس کتاب میں کربلا کے واقعہ کے بعد سے خلفائے بنی اُمیّہ اور پھر بنی عباس کی تاریخ اُنکے خاتمہ تک لکھی ہے۔ آخر میں ان حکومتوں کے بھی حالات دیئے ہیں جو بنی فاطمہ نے خود اپنی کوششوں سے قائم کیں۔ اور جنکے قیام میں شیعیان علیؓ کی جماعتوں نے بہت کم حصہ لیا۔ نیز مصر کی خلافت فاطمی کی بھی مختصر تاریخ دی ہے۔ کتاب بحیثیت مجموعی تاریخی معلومات کے لحاظ سے عمدہ ہے۔ اور چھپائی لکھائی صاف ہے۔ قیمت فی نسخہ ایک روپیہ آٹھ آنہ

ملنے کا پتہ:- مینجر صاحب رسالہ پیشوا۔ جامع مسجد۔ اُردو بازار دہلی

... دنیا میں سار ... ... دو ٹکڑوں میں تقسیم کرنا ... ... کی ...

... ترتیب دیتے ہیں، اور متحدہ قوم ... ذاتی وحامی ... متحدہ قومیت اور اسلام ...

... کیا فرماتے ہیں

جب ہم اس نامۂ نبوی کو دیکھتے ہیں وہ صاف دو حصوں میں منقسم معلوم ہوتا ہے پہلے حصہ میں جو چودہ دفعات تک چلا گیا ہے رسول اللہ کی بیشتر تعلیمات اور ہدایتیں ایسی ہیں جن کا تعلق عملاً مسلمانوں سے ہے۔ اس حصہ میں یوں تو ساری ہی باتیں اہم ہیں لیکن میرے خیال میں حال کے حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے تیسری، چوتھی اور ساتویں دفعہ بہت ہی اہم ہیں۔ تیسری دفعہ جو اُمت واحدہ کے استحکام کے لیے ہے مطلب اس کا یہ ہے (اصل دفعہ یا اس کے ترجمہ کو ایک دفعہ پھر پڑھ لیجیے) کہ مسلمانو تمہارے اتحاد میں فساد ڈالنے والا خواہ وہ تم سے کسی کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو تم سب کا دشمن ہے۔ تم سب مجموعی حیثیت سے اس کے خلاف اُٹھ کھڑے ہو، اسے اپنا سب کا دشمن جانو، مومن کے مقابلہ میں غیر مومن کی کسی حال میں مدد نہ کرو۔ چوتھی دفعہ یہ ہے کہ تم سب برابر ہو اللہ کا ذمہ ایک ہے جس نے دے دیا دے دیا۔ تم میں سے ایک ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی بھی سارے مسلمانوں کی طرف سے جسے چاہے (بشرطیکہ اُمت واحدہ کے فائدہ کے لیے ہو) پناہ اور ذمہ دے سکتا ہے جو سب کو ماننا چاہیے۔ ساتویں دفعہ کا ماحصل یہ کہ مسلمانوں کی صلح ایک اور صرف ایک ہے یہی اللہ کی صلح ہے۔ خبردار یہ نہ ہو تمہارا ایک آدمی یا ایک گروہ ایک طرف صلح کرے، اور دوسرا یا دوسرا گروہ لڑائی۔ جب صلح کرو، سب مل کر ایک صلح کرو، کوئی صلح کرے تو اس طرح کہ صلح میں سارے مسلمانوں کا مفاد برابر رہے۔

نامہ کا دوسرا حصہ زیادہ تر غیروں سے متعلق ہے، اس کو پڑھنے سے صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بالا دست دفاعی اغراض کے لیے غیر مذہب والوں کو اپنی جماعت میں شریک کر رہا ہے، لیکن

نہایت خودداری کی شان کے ساتھ، انہیں شریک کرتا اور شریک کرنا چاہتا ہے لیکن صرف اتنا کہتا ہے ومن تبعنا من الیہود جو یہود ہمارے ساتھ ہونا چاہیں۔ پھر اس شرکت و وفاق کی شرطیں خود پیش کرتا ہے۔ ان شرطوں میں انسانیت، انصاف، مروت سب کچھ برتتا ہے لیکن اپنی اور اپنی جماعت کی فوقیت کو بہرحال نمایاں رکھتا اور صاف صاف کہدیتا ہے کہ جو لوگ ہمارے ساتھ ہونا چاہیں وہ ہماری اجازت کے بغیر مدینہ سے باہر نہ جاسکینگے ہاں وہ باجازت باہر جائیں، یا مدینہ کے اندر اندر رہیں تو وہ ہماری طرف سے مامون رہینگے۔ اور یہ وفاق چونکہ دفاعی وفاق ہے کہ اس میں ان کا بھی فائدہ ہے۔ جنگ کے زمانہ میں اُن کو اپنا خرچ آپ اُٹھانا ہوگا، جیسے مسلمان اپنا خرچ آپ اُٹھائینگے۔ اور اگر احیاناً اس اُمۃ واحدہ میں کوئی جھگڑا ایسا اُٹھ کھڑا ہو جس سے عام فساد پھیلنے کا اندیشہ ہو تو اس کا فیصلہ ہم خود کرینگے۔ (دفعات ۲۲-۲۳-۴۰)

یہ اور اسی قسم کی ہدایتیں اور شروط مصلحت کے قالب میں ڈھلی ہوئی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) غیر مذہب والوں کے سامنے جبکہ ان کو اپنے ساتھ ملانا بھی چاہتے ہیں ایسے وقت میں پیش کرتے ہیں کہ مدینہ میں کوئی اعلیٰ قوت آپ کے ساتھ نہیں ہے۔ ساز و سامان کی الگ کمی ہے اور سامنا قریش جیسے دشمن سے ہے جو شوکت و قوت بھی رکھتا ہے اور ساز و سامان بھی۔

رسول اللہ نے اُمت واحدہ مرتب کی تو ایسی ایسی اہم قیود اور شروط کے ساتھ لیکن متحدہ قومیت و اسلام کے اتنی صفحات میں ان میں سے جگہ ملی تو صرف ذیل کی شروط کو۔

(۱) لڑائی میں یہود اپنا خرچ کریں اور مسلمان اپنا (۲) بنی عوف کے یہود مسلمانوں کے ساتھ ایک اُمت ہیں (۳) یہود کے لیے اُن کا دین اور مسلمانوں کے لیے اُن کا (۴) مسلمان باہم ایک دوسرے کے معاون و مددگار ہونگے (۵) جو یہودی ہمارا اتباع کریگا ہماری طرف سے اس کے لیے بھلائی ہوگی ظلم ہرگز نہ ہونے پائیگا[1]

[1] نوٹ صفحہ ۵، ۲ پر ملاحظہ ہو۔

نامہ نامی کی باقی دفعات کیوں نظرانداز کی گئیں اس کو نظرانداز کرنے والے جانیں یا خدا ہم بہر حال اس کو پسند نہیں کرتے کہ اپنے مطلب کی دفعات لے لی جائیں اور باقی خصوصاً ایسی دفعات کو جو اپنے مدعا کے خلاف جاتی ہوں قطعاً نظرانداز کر دیا جائے۔

اب آیئے اُمتہ واحدہ کی طرف کہ اسی ایک دولفظی مرکب نے تفریق و تقسیم کا ایک ہنگامہ برپا کر رکھا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ واحدہ اور متحدہ میں فرق ہے۔ پہلا لفظ فردانیت کو چاہتا ہے اور دوسرا ترکیب کو لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ یہاں واحدہ سے متحدہ ہی مراد ہے اور معنی اس کے متفقہ ہیں رہا لفظ امت وہ بھی قوم کے معنی میں آیا اور آتا ہے لیکن خود لفظ قوم دو معنیٰ پر دلالت کرتا ہے۔ اوّل مطلق جماعت، دوسرے جماعت بصفات مخصوصہ۔ مثلاً اتحادِ نسل، مذہب، اتحادِ وطن، اتحادِ زبان، اخلاق واطوار، تمدن وتہذیب کی یک رنگی، رسوم کی مماثلت، موت زندگی، شادی غمی، ملنے جلنے، رہنے سہنے میں افراد قوم کی باہمی ہم آہنگی، وغیرہ "رسالہ متحدہ قومیت" میں میں سمجھتا ہوں قوم کے معنی نہ یہ مراد ہیں نہ وہ۔ وہ یعنی قوم کے پہلے معنی سرے سے اس رسالہ کے کام ہی کے نہیں اور دوسرے معنی قوم کے نہ ہندوستان میں پائے جاتے ہیں نہ زیر تجویز متحدہ قومیت سے ان کی توقع کی جاتی ہے۔ یہاں صرف رشتۂ وطنیت پر متحدہ قومیت کی بنیاد رکھی جاتی تاکہ اہل وطن کی مشترکہ اغراض حاصل ہو سکیں لیکن رسول اللہ نے مدینہ منورہ میں اگر کوئی متحدہ قومیت بنائی تھی تو اس میں باستثنائے مذہب مذکورہ بالا ساری صفات موجود تھیں کیونکہ وہ یہودی جن کا ذکر نامۂ نبوی میں آیا ہے اور جو مسلمانوں کے ساتھ امت واحدہ یا متحدہ قوم کا جز تھے، سب کے سب عرب تھے، ایک ملک کے رہنے والے تھے، ایک دوسرے کے رشتہ دار تھے۔ ماں کی طرف سے خود رسول اللہ کے

(نوٹ صفحہ ۲۷۴) لہ ہم سابقاً ایک جگہ لکھ چکے ہیں کہ ابو عبید کی روایت کا متن بہ نسبت ابن ہشام کی روایت کے کم ہے۔ اس سے یہ دھوکا نہ ہونا چاہیے کہ متحدہ قومیت و اسلام میں جو دفعات اختیار کی گئی ہیں وہ ابو عبید کی روایت کا متن ہوگا۔ یہ انتخاب در انتخاب ہیں۔ اصل سے مقابلہ کر کے دیکھ لیجیے۔

قرابت دار تھے، ایک زبان بولتے تھے، اخلاق و اطوار تہذیب و تمدن ان کا ایک تھا، یکساں معاشرت تھی۔ اوضاع و اطوار رسم و رواج میں باہم غیریت نہ تھی۔ غرض قوم و اُمت کے اوصاف کثیرہ اُن میں موجود تھے۔ مذہب نے اُن کو اُمتِ عربیہ قومیت عربیہ سے خارج نہیں کیا تھا، اس لیے وہ ابھی اپنی اصل پر اُمتہ واحدہ تھے۔ رسول نے صرف اتنا کیا کہ دو مذہب والوں کی دنیاوی اغراض کے لیے ایک پارٹی بنا دی اور بس اور وہ بھی ایک وقتی مصلحت تھی، وقت آیا تو آپ نے اپنے عمل سے اور اللہ نے اپنے حکم سے اس پارٹی کا خاتمہ کر دیا۔ اور جب تک بھی یہ پارٹی رہی اس کا اصل اصول رہا۔ نامسلم کا تابع ہونا اور مسلم کا متبوع ہونا۔ آیئے اب دیکھیے کہ جن یہود کا نامہ نبوی میں ذکر آیا ہے وہ واقعی ایسے تھے بھی جیسا کہ ہم نے انہیں بتایا ہے یا نہیں۔

مدینہ میں جس کا قدیم نام یثرب تھا دو نسلاً متمائز قومیں آباد تھیں۔ ایک قحطانی عرب۔ دوسرے اسرائیلی یہود۔ یہ عرب دو قبیلوں میں منقسم تھے، خزرج اور اوس۔ اور اسرائیلی تین قبیلوں میں۔ بنو القینقاع، بنو النضیر اور قریظہ۔ سارے یثرب میں یہی تینوں قبیلے نسلاً یہودی تھے لیکن وہ اوروں کو بھی اپنے مذہب میں شامل کر لیتے اور کر سکتے تھے، اس لیے بہت سے عرب بھی یہودی ہو گئے تھے۔ خاص کر اوس اور خزرج میں۔ کہ عرب میں وہی اُن کا مرکز تھا

اوس و خزرج والے اہل کتاب سمجھ کر یہود کا بڑا احترام کرتے تھے یہاں تک کہ ان قبیلوں میں اگر کسی عورت کے اولاد خاص کر نرینہ اولاد نہ ہوتی تو وہ منت مانتی کہ خدا مجھے بیٹا دیگا تو میں اس کو یہودی بناؤنگی اور جب بیٹا ہوتا تو منت کے موافق اسے یہودی بنا دیتی۔ ممکن ہے کچھ لوگ خود بھی یہ مذہب اختیار کر لیتے ہوں۔ ان وجوہ سے اوس و خزرج کے بطون میں یہودیوں کی اچھی خاصی تعداد ہو گئی تھی، بلکہ مذہب کے ایسے ایسے عالم بھی ان میں پیدا ہو گئے تھے کہ احبار یہود سے بھی بڑھ چڑھ کر مانے جاتے تھے۔ اسرائیلی یہود بھی ہم مذہبی کی بنا پر ان کی عزت کرتے اور ان کی قوم قبیلہ کے لوگ بھی

کہ آخر انہی میں سے تھے۔ بنو ساعدہ، بنو الحرث، بنو جشم، بنو النجار۔ بنو عمرو بن عوف، بنو النبیت، بنو الاوس وغیرہ جن کا نام نامۂ نبوی میں آیا ہے سب کی سب اوس وخزرج ہی کی شاخیں تھیں[1]، اور ان میں سے ہر ایک میں کچھ کچھ یہودی مذہب کے لوگ موجود تھے، جن میں عالم بھی تھے اور عامی بھی مگر کثرت ان میں مشرکین کی تھی، جو قریش مکہ کی طرح بتوں کی پرستش کیا کرتے تھے۔

ظاہر ہے کہ یہود بنی اسرائیل سرزمین عرب میں اجنبی تھے خواہ مدتوں سے مدینہ رہتے چلے آئے ہوں۔ برخلاف اس کے اوس وخزرج دونوں خاک عرب سے ہی اُٹھے تھے۔ اس لیے کبھی کبھی ان عربوں اور اسرائیلیوں میں لڑائی ہو جاتی تھی۔ کبھی یہ غالب آتے اور کبھی وہ کہتے ہیں کہ آخری لڑائی ان میں وہ ہوئی جو یوم بعاث کے نام سے مشہور ہے۔ اس لڑائی میں کہیں بنی اسرائیل عربوں سے کہہ بیٹھے کہ تمہاری شامت قریب آلگی ہے۔ آنیوالا نبی جس کی توریت میں خبر دی گئی ہے آیا ہی چاہتا ہے ہم اُس کے ساتھ ہو کر تمہاری اچھی طرح خبر لینگے۔ اوس وخزرج ابھی اس بات کو نہ بھولے تھے کہ حج کے لیے مکہ پہنچے، وہاں دعوت اسلام شروع ہو چکی تھی۔ رسول اللہ نے ان لوگوں کو بھی اللہ کا پیغام پہنچایا۔ اگر یہود کی دھمکی واقعی تھی تو اس کی یاد۔ اس پر کلمۃ الحق کا اثر۔ وہ مسلمان ہو گئے اور مدینہ پہنچ کر اسلام کی تبلیغ شروع کر دی۔ اور دوسرے سال مکہ آکر نصرت و حمایت کے وعدہ پر رسول اللہ کو مدینہ بلا لیا۔ رسول اللہ نے مدینہ پہنچ کر اوس وخزرج دونوں کو انصار کا خطاب دیا۔ جو لوگ اب تک ان میں سے ایمان لائے تھے سچے دل سے ایمان لائے تھے۔ انہوں نے نشر و تبلیغ اسلام میں ایسی کوشش کی کہ اوس وخزرج میں تھوڑے ہی دنوں میں گھر گھر مسلمان دکھائی دینے لگے۔

رسول اللہ کو یثرب کے یہودیوں سے توقع تھی کہ وہ دعوت اسلام کو جلدی اور بآسانی

---

[1] دیکھیے۔ جریدہ من حضر بدرا من المسلمین من قریش و من معھم۔ سیرت

قبول کرلینگے لیکن وہی آپ کے زیادہ سے زیادہ دشمن اور مخالف اسلام ثابت ہوئے وجہ یہ کہ وہ اپنے آپ کو خاصانِ خدا شمار کرتے تھے اور سمجھے بیٹھے تھے کہ توریت کی پیشین گوئی کے مطابق جو نبی آنے والا ہے وہ انہی میں پیدا ہوگا۔ جب دیکھا کہ وہ بنی اسمٰعیل میں آیا تو جل مرے اور اپنا دیرینہ وقار جاتا دیکھ کر حق کی مخالفت پر آمادہ ہوگئے اور مشرکین مکّہ سے بھی سبقت لے گئے۔

جب یہودی بنی اسرائیل کی طرف سے اسلام کی مخالفت شروع ہوئی تو دوعملی میں جان آئی ان مذہبی یہودیوں کی جو اُن عرب قبیلوں میں تھے جن کے نام ہم لکھ آئے ہیں اور بتا آئے ہیں کہ وہ اوس وخزرج کی شاخیں ہیں مذہب اُن کو بنی اسرائیل کی طرف کھینچتا تھا، اور خون کا تعلق اپنے اُن رشتہ داروں کی طرف جو مسلمان ہو چکے تھے۔ آخر جو دلیر تھے وہ ایک طرف ہو کر یا یہودیت پر اڑ گئے یا سچّے دل سے مسلمان ہو گئے، لیکن ایسے دلیر کم ہمیشہ کم ہی ہوا کرتے ہیں کثرت ہمیشہ ہوتی ہے دل کے بودوں کی، خاص کر جہاں اس قسم کی کشمکش ہو۔ ناچار اوس و خزرج میں جو لوگ اس قسم کے تھے اُنہوں نے عموماً منافقت اختیار کی۔ ظاہر میں مسلمان تھے اور باطن میں یہودی یا یہودیوں کے طرفدار تھے مگر انہی میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو یونہی کچدار و مریز میں گزارتے تھے، نہ ابھی یہودیت کو چھوڑتے تھے نہ قوم وقبیلہ ہی سے جو بیشتر مسلمان ہو چکے تھے، بگاڑ کرنا پسند کرتے تھے۔ یہودی تھے مگر اکثر معاملات میں قبیلہ کا ساتھ دیتے تھے۔ اس لیے ان کے باب میں مصلحت یہی ہوئی ہوگی کہ رسول اللہ ان کو اپنے اور اپنی جماعت کے ساتھ رکھیں اسی لیے مسلمانوں اور ان یہود کی ایک اتحادی جماعت بنادی۔

مدینہ پہنچ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی سال بھر تک محض دعوت اسلام اور اس کی تبلیغ میں مشغول رہے تھے کہ غزوات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ یہ کیوں؟ اس کے بیان کا یہ موقعہ نہیں مگر یہاں اتنا بتانا ہی چاہیے کہ ابتدائی غزوات وسرّیات میں صرف مہاجرین ہی قریش کے خلاف

جلتے رہے۔ بدر القتال پہلا غزوہ تھا جس میں انصار ان کے ساتھ شریک ہوئے۔ اوّل اوّل رسول اللہ کو خیال رہا کہ دیکھیے انصار غزوہ میں شریک ہوتے ہیں یا یہ کہہ دیتے ہیں کہ ہم نے مدینہ میں حمایت و نصرت کا وعدہ کیا ہے نہ مدینہ سے باہر جاکر لڑنے مرنے کا لیکن جب آپ نے انصار سے اس کا ذکر کیا اور اُنہوں نے جواب دیا کہ ہم آپ کی رسالت پر ایمان لائے ہیں آپ کے ساتھ سمندر میں کودنے کو تیار ہیں تو آپ کو اطمینان ہوا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانہ کے آس پاس یہ نامہ جو میرے نزدیک ایک دستور العمل ہے، آپ نے مومنین قریش، انصار اور انصار ہی کے رشتہ دار یہودیوں کے باب میں لکھوایا۔ کہ ان یہودیوں سے (اس لیے کہ وہ ایمان نہ لانے کے باوجود اپنے مسلمان رشتہ داروں کے ساتھ ساتھ تھے) عصبیت قومی کی بنا، پر یہ توقع ہو سکتی تھی کہ وہ شریک غزوات ہو جائیں، اسی لیے سرنامہ میں یہ الفاظ لکھوائے۔ ومن تبعھم فلحق بھم وجاھد معھم اور پھر ومن تبعنا من الیھود کے بعد صرف وہی قبائل نام بنام ذکر کیے، جن میں اسلام عام ہو چکا تھا اور یہودی کم رہ گئے تھے، اور وہ بھی کچھ ایسی حالت میں تھے کہ ظن غالب یہ تھا کہ وہ اپنے ہم قبیلہ مسلمانوں کا ساتھ دینگے۔ اسی لیے جن یہود سے یہ توقع نہ تھی یعنی بنی قینقاع، بنی نضیر اور قریظہ ان کا نام بھی اس نامہ میں نہیں ہے، نہ کبھی آپ نے ان کو جہاد میں شریک کرنا پسند کیا۔

رسول اللہ احد کو قریش کے مقابلہ کے لیے جا رہے تھے کہ عبداللہ ابن اُبی بن سلول جو راس المنافقین تھا رسول اللہ کے تہائی ہمرائیوں کو ساتھ لے کر آپ سے جُدا ہوا اور مدینہ واپس چلا آیا۔ ظاہر ہے کہ یہ کیسا نازک وقت ہوگا۔ زہری سے روایت ہے کہ بعض انصار نے حضرت کی خدمت میں عرض کیا کہ ہم اپنے حلیف یہود (بنی النضیر اور قریظہ) کو نہ بلالیں وہ آکر ہماری مدد کرینگے آپ نے فرمایا "لاحاجۃ لنا فیھم" نہیں ہمیں ان کی ضرورت نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہود بنی اسرائیل

کو کبھی آپ نے شریک جہاد نہیں کیا۔ اس لیے زیر بحث نامۂ نبوی کے متعلق یہ خیال کرنا کہ اس میں عام یہود مدینہ کے ساتھ معاہدہ پایا جاتا ہے یا ومن تبعنا من الیہود عام ہے اور یہود بنی اسرائیل یہودی (نامسلم) رہ کر بھی اس نامہ کے تحت میں تھے یا آسکتے تھے، کسی طرح صحیح نہیں[1]۔ مگر "متحدہ قومیت اور اسلام" میں جو کچھ اس نامہ کے متعلق لکھا ہے اُس سے مفہوم ہوتا ہے کہ مدینہ کے عام اور تمام یہودی اس معاہدہ میں شریک تھے۔ اور رسول اللہ نے مومنین قریش، مدینہ کے انصار اور مدینہ کے عام یہود سے ایک متحدہ قوم بنائی تھی۔ اور پھر اس پر طرہ یہ ہے کہ اوس و خزرج کے ان بطون کو جنہیں رسول اللہ انصار کا خطاب دیتے ہیں یہودیوں کے قبائل مختلفہ قرار دے دیا ہے۔ چنانچہ صفحہ ۴۷ لکھا ہے

"یہ عہدنامہ بہت طویل ہے، جس میں مسلمانوں کے قبائل مہاجرین اور انصار کا تفصیلاً ذکر کیا گیا ہے اور اسی طرح یہودیوں کے قبائل مختلفہ کا تذکرہ ہے"

حالانکہ اس نامہ میں نہ قبائل مہاجرین کا ذکر ہے نہ یہودیوں کے قبائل مختلفہ کا۔ بلکہ انصار کے قبائل اور اُن قبائل میں جو یہودی تھے اُن کا ذکر ہے۔ اگر کہا جاتا کہ قبائل مختلفہ کے یہودیوں کا تذکرہ ہے تو یہ البتہ صحیح ہوتا۔ رہے یہود بنی اسرائیل ان کا نامہ میں کہیں نام ہی نہیں ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ جن بطون و عشائر کا نام نامہ میں آیا ہے۔ جیسے وہ انصار اور مسلمانوں کے قبیلے تھے ویسے ہی وہ یہود کے بھی قبائل تھے، اس مناظرانہ نکتہ آفرینی سے میں کیا کوئی بھی انکار نہ کرسکیگا، لیکن سوال یہ ہے کہ جو کچھ لکھا گیا ہے اُس کے پڑھنے والے بھی اس سے یہی سمجھتے ہیں یا نہیں میں نے جس سے پوچھا مجھے کسی نے یہ مفہوم نہیں بتایا۔ یہ خدا جانے یا لکھنے والے کہ لکھنے کے وقت

---

[1] یہاں بحث اس نامہ سے اور اس امر سے ہے کہ مفروضہ متحدہ قومیت میں یہود بنی اسرائیل بھی شامل تھے یا نہیں۔ اس سے بحث نہیں ہے کہ یہود بنی اسرائیل کسی طرح بھی رسول اللہ اور مسلمانوں کے حلیف تھے یا نہیں وہ حلیف تھے مگر اس حیثیت سے کہ اوس و خزرج کے حلیف تھے نہ اس حیثیت سے کہ اس نامہ کے ماتحت تھے۔ اور فرضی متحدہ قوم میں شامل۔

دل میں کیا خیال کیا تھا۔ کتاب میں مجھے یہ مفہوم کہیں نہیں ملا۔ کتاب کی عبارت سے وہی مطلب نکلتا ہے جو ہم نے بیان کیا اور پڑھنے والوں نے بھی عموماً یہی سمجھا۔

ابھی مفروضات خیالی میں ہمارے سامنے ایک فرض اور باقی ہے کہ ہم یہ بھی فرض کرلیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے نہ صرف ایک متحدہ قومیت بنائی اور ضرور بنائی بلکہ صرف رشتۂ ہموطنیت کی بنا پر بنائی۔ لیجئے ہم نے یہ بھی فرض کرلیا۔ جس عالم، علماء کی جماعت، جس مسلمان، مسلمانوں کی جماعت میں طاقت ہے، ہندوستان میں مسلم و غیر مسلم کے ارتباط سے متحدہ قوم بنائے اور محض رشتۂ ہموطنیت کی بنا پر بنائے۔ مگر ایسی تو بنائے کہ اس میں غیر مسلم تابع ہوں اور مسلم متبوع، اور اس کو "اُمَّةٌ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ" بھی اگر کوئی چاہے تو کہہ دے اور پھر اس پر کوئی یہ کہنے والا نہ ہو، یہ کیا کہا۔ جیسے رسول اللہ نے زبان ہی سے نہیں کہا بلکہ لکھوا دیا تھا کہ وان یہود بنی عوف اُمَّةٌ من المؤمنین۔ لیکن متحدہ قومیت اور اسلام میں تو ہم یہ لکھا ہوا پاتے ہیں "مذکورہ بالا بیان سے یہ واضح ہوگیا کہ مسلمانوں کا غیر مسلموں سے مل کر ایک قوم بننا یا بنانا نہ تو ان کے نفس دین میں خلل انداز ہے اور نہ یہ امر نفسہٖ اسلامی قوانین اجتماعیہ کے خلاف ہے، نامۂ مبارک اور اس کی نصی دلالت کی بنا پر غیروں کو اپنے میں ملاکر متحدہ قومیت بنانا مسلّم، لیکن مل کر متحدہ قوم بن جانا، مغلوبانہ نہ سہی مرتبۂ مساویانہ سہی اس نامہ کی کون سی دفعہ کون سے فقرہ اور کون سے الفاظ سے ثابت ہوا۔ اور وہ کون سے زمانہائے سابقہ تھے جس میں مسلم باختیار خود ایسی قوم بن کر رہے اور اس امر کو اس نامۂ نبوی یا کسی اور حکم مذہبی کے مطابق بھی مانا۔ کاش یہ باتیں بھی رسالہ میں کہیں موجود ہوتیں کہ ہمیں اس سوال کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔

اگر یہ غیر مسلموں میں مل کر قوم بننا اجتہاد پر مبنی ہے تو ایسے اجتہاد کی خواہ وہ کسی کا ہو نص صریح کے مقابلہ میں قدر و قیمت معلوم، رسول اللہ سر نامہ نامۂ مبارک میں فرمائیں وَمَنْ تَبِعَهُمْ فَلَحِقَ بِهِمْ وَجَاهَدَ مَعَهُمْ۔ اور یہی بات سارے نامہ میں ظاہر نظر آئے مگر متحدہ قومیت کے داعی و حامی اس کے برعکس کا دعویٰ کریں اور پھر اسی نامہ سے اپنے دعوے کو ثابت کرنے کی کوشش کریں ھٰذا والله لشیٔ عجاب +

تبرکات

(۱) علم و عشق

حضرت علامہؒ کے کلام میں علم و عشق یا فکر و نظر کے الفاظ بڑی کثرت سے استعمال ہوئے ہیں۔ سطح بین نگاہیں بعض مقامات پر ان کے صحیح مفہوم کا کماحقہٗ ادراک نہیں کر سکتیں جو بعض اوقات غلط فہمی کا موجب بن جاتا ہے۔ حضرت علامہؒ نے اپنے ایک مکتوب گرامی (بنام خواجہ غلام السیدین صاحب) میں ان الفاظ کا مفہوم واضح کیا ہے جسے بصد فخر درج ذیل کیا جاتا ہے :۔

"علم سے میری مراد وہ علم ہے جس کا دارومدار حواس پر ہے۔ عام طور پر میں نے علم کا لفظ انھیں معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس علم سے ایک طبعی قوت ہاتھ آتی ہے جس کو دین کے ماتحت رہنا چاہیے۔ اگر دین کے ماتحت نہ رہے تو محض شیطنت ہے۔ یہ علم، علمِ حق کی ابتدا ہے جیسا کہ میں نے جاوید نامہ میں لکھا ہے :۔

علمِ حق اوّل حواس آخر حضور　　　آخر او می نگنجد در شعور

وہ علم جو شعور میں نہیں سما سکتا اور علمِ حق کی آخری منزل ہے اس کا دوسرا نام عشق ہے۔ علم و عشق کے تعلق میں جاوید نامے میں کئی اشعار ہیں۔

علم بے عشق است از طاغوتیاں　　　علم با عشق است از لاہوتیاں

مسلمان کو لازم ہے کہ علم کو (یعنی اس علم کو جس کا۔۔۔ مدار حواس پر ہے اور جس سے بے پناہ قوت پیدا ہوتی ہے) مسلمان کرے۔ "بولہب را حیدرِ کرار کن"۔ اگر یہ بولہب حیدرِ کرار بن جائے یا یوں کہیے کہ اگر اس کی قوت دین کے تابع ہو جائے تو نوعِ انسان کے لیے سراسر رحمت ہے۔

(۲) فنونِ لطیفہ

ہمایوں بابت مئی ۱۹۳۸ء میں پروفیسر حمید احمد خاں صاحب نے حضرت علامہ سے اپنی ایک ملاقات کی روئداد شائع کی تھی۔ اس میں سے فنونِ لطیفہ سے متعلق اقتباس بہ مسرت درج کیا جاتا ہے قارئین اس امر کو ملحوظ رکھیں۔۔۔ کہ اس روئداد کی حقیقت روایت بالمعنی کی سی ہے۔ اس میں مندرجہ صدر

مکتوب گرامی کی طرح الفاظ حضرت علامہؒ کے نہیں ہیں۔

سوال:۔ آجکل ہندوستان کے "نیشنل انتھم"[1] کے متعلق بڑی بحث ہو رہی ہے آپ کی اس مسئلے کے متعلق کیا رائے ہے۔

ڈاکٹر صاحب:۔ "نیشنل انتھم" تو اس صورت میں ہو کہ کوئی "نیشن"[2] ہو۔ جب سرے سے نیشن ہی کا کوئی وجود نہیں ہے تو "نیشنل انتھم" کہاں ہو سکتا ہے۔ میری تو یہ رائے ہے کہ ہندوستان کو کسی نیشنل انتھم کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

سوال:۔ بندے ماترم پر بڑا اعتراض یہ ہے کہ ایک تو یہ بنگالی ہے۔ دوسرے اس کے آہنگ میں گرمی نہیں ہے۔

ڈاکٹر صاحب (ذرا گرمی سے) آپ ہندوؤں کی شاعری میں گرمی ڈھونڈتے ہیں؟ ہندو شاعری کے تمام دفتر دیکھ ڈالئے کہیں گرمی نظر نہیں آئیگی۔ ہندو کو ہر جگہ شانتی کی تلاش ہے۔ ہندوؤں کی ادبی پیداوار میں میرے نزدیک اس کی صرف ایک استثناء ہے۔ رامائن۔ اور وہ بھی بعض بعض حصوں میں۔

سوال:۔ مگر ہندوستان کی موسیقی تو خاص ہیجان انگیز ہے۔ قوالی میں ایسی موسیقی کافی گرمی پیدا کر لیتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب:۔ میں اسے مصنوعی گرمی کہتا ہوں جس طرح کسی قسم کے نشے سے کوئی شخص طبیعت میں ہیجان پیدا کر لے۔

سوال:۔ کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ وجد و حال کی کیفیت مصنوعی ہے۔ مثلاً ہمارے ہاں سیالکوٹ میں نوشاہو کا میلہ ہوتا ہے۔ وہاں قوالی سے بعض لوگ ایک دم حال میں آجاتے ہیں کیا وہ آپ کے نزدیک محض دکھاوا ہے؟

ڈاکٹر صاحب:۔ ان لوگوں نے وجد و حال کو ایک Cult (دستور) بنا لیا ہے۔ یہ حالت واقعی اُن پر طاری ہوتی ہے لیکن جب وہ اپنے جوشِ جذبات کو اس طرح سے فرو کر لیتے ہیں تو پھر ان میں باقی کچھ نہیں رہتا۔ اور وہ جذبہ دوبارہ طاری نہیں ہوتا۔ دراصل مسلمان جب عرب سے نکلے اور اُن کو باہر کی قوموں سے سابقہ پڑا تو صوفیہ نے ان قوموں کی طبعی نسائیت کا لحاظ کرتے ہوئے قوالی اور موسیقی کو اپنے نظام میں شامل کر لیا۔ نسائیت سے مراد فالتو جذبات ہیں ایران اور ہندوستان میں فالتو جذبات کی کثرت ہے۔ اور حال انھیں فالتو جذبات کے اخراج کا ایک ذریعہ ہے۔ صوفیوں کے سلسلوں میں قوالی کو جو دخل ہے وہ صرف اسی وجہ سے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی موسیقی کا کوئی وجود ہے ہی نہیں۔ اس وقت عام اسلامی ممالک میں اپنا اپنا مقامی فنِ موسیقی رائج ہے مسلمان جہاں پہنچے وہیں کی موسیقی انھوں نے قبول کر لی۔ اور کوئی اسلامی موسیقی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ یہ واقعہ ہے کہ

---

[1] قومی ترانہ [2] قوم

فنِ تعمیر کے سوا فنون لطیفہ میں سے کسی میں بھی اسلامی روح نہیں آئی۔ اسلامی تعمیرات میں جو کیفیت نظر آتی ہے وہ مجھے اور کہیں نظر نہیں آتی۔ البتہ پچھلی مرتبہ یورپ سے واپسی پر مصر جانے کا اتفاق پیش آیا۔ اور وہاں قدیم فرعونوں کے مقابر دیکھنے کا موقع ملا۔ ان قبروں کے ساتھ مدفون بادشاہوں کے بُت بھی تھے۔ جن میں قوت و ہیبت کی ایک ایسی شان تھی جس سے میں بہت متاثر ہوا۔ قوت کا یہی احساس حضرت عمرؓ کی مسجد اور دلّی کی مسجد قوۃ الاسلام بھی پیدا کرتی ہے بہت عرصہ ہوا جب میں نے مسجد قوۃ الاسلام کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ مگر جو اثر میری طبیعت پر اس وقت ہوا وہ مجھے اب تک یاد ہے۔ شام کی سیاہی پھیل رہی تھی اور مغرب کا وقت قریب تھا۔ میرا جی چاہا کہ مسجد میں داخل ہو کر نماز ادا کروں۔ لیکن مسجد کی قوت و جلال نے مجھے اس درجہ مرعوب کر دیا کہ مجھے اپنا یہ فعل ایک جسارت سے کم معلوم نہ ہوتا تھا۔ مسجد کا وقار مجھ پر اس طرح چھا گیا کہ میرے دل میں صرف یہ احساس تھا کہ میں اس مسجد میں نماز پڑھنے کے قابل نہیں ہوں۔

اندلس کی بعض عمارتوں میں بھی اسلامی فنِ تعمیر کی اس خاص کیفیت کی جھلک نظر آتی ہے لیکن جوں جوں قومی زندگی کے قویٰ مضمحل ہوتے گئے تعمیرات کے اسلامی انداز میں ضعف آتا گیا۔ وہاں کی تین عمارتوں میں مجھے ایک خاص فرق نظر آیا۔ قصر زہرا دیووں کا کارنامہ معلوم ہوتا ہے۔ مسجد قرطبہ مہذب دیووں کا۔ مگر الحمرا محض مہذب انسانوں کا!

پھر ایک تبسم کے ساتھ ڈاکٹر صاحب نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:۔ میں الحمرا کے ایوانوں میں جا بجا گھومتا پھرا۔ مگر جدھر نظر اٹھتی تھی دیوار پر "ھُوَ الْغَالِبُ" لکھا ہوا نظر آتا تھا۔ میں نے دل میں کہا یہاں تو ہر طرف خدا ہی خدا غالب ہے۔ کہیں انسان غالب نظر آئے تو بات بھی ہو۔

اس کے بعد تھوڑی دیر تک ہندوستان کی اسلامی عمارات کا ذکر ہوتا رہا۔ تاج محل کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے فرمایا:۔ مسجد قوۃ الاسلام کی کیفیت اس میں نظر نہیں آتی۔ بعد کی عمارتوں کی طرح اس میں بھی قوت کے عنصر کو ضعف آ گیا ہے۔ اور دراصل یہ قوت کا عنصر ہے جو حسن کے لئے توازن قائم کرتا ہے۔

سوال:۔ دلّی کی جامع مسجد کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

ڈاکٹر صاحب۔ وہ تو ایک بیگم ہے۔

ہم اس فقرے پر ہنسے اور ڈاکٹر صاحب بھی ہمارے ساتھ شریک ہو گئے۔ اس منزل پر اسلامی تعمیرات کے متعلق یہ دلکشا بحث ختم ہوئی۔ ....."

عورت کی حیثیت

(از جناب شیخ سراج الحق صاحب بی اے)

کہتے ہیں کہ شاہجہاں کو جب بیٹے نے قلعہ میں نظر بند کر دیا تو اس نے کہلا بھیجا کہ چند لڑکے میرے پاس بھیجدیئے جائیں جن کو میں پڑھاتا رہوں۔ آپ اس واقعہ کو سُنکر مُسکرا دیجئے۔ معزول بڈھے کے اس جذبہ کو طفلانہ پن کہکر اس کی ہنسی اُڑائیے۔ لیکن یقین مانئے کہ آپ خود اپنی نفسیاتی کیفیت کا جب تجزیہ کرینگے تو معلوم ہو جائے گا کہ شاہجہاں نے محض اپنے جذبات ہی کا اظہار نہیں کیا بلکہ نوع انسانی کے قلوب کی ترجمانی کی ہے۔ حکومت کا جذبہ انسان میں فطری معلوم ہوتا ہے ہر شخص کسی نہ کسی دائرے میں حکمران ہونا چاہتا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہر شخص حکمران ہو کیسے؟ لہٰذا عام انسانوں نے اس جذبہ کی تسکین کے لئے امیال و عواطف سے کام لیا۔ احتیاج۔ محکومیت زیر دستی کا دوسرا نام ہے۔ اس لئے انسانی زندگی میں جہاں جہاں اور جس جس گوشہ میں احتیاج تھی وہیں زبردستی کے آثار اُبھرنے شروع ہو گئے۔ بیٹا باپ کا محتاج ہے۔ اِس لئے اس کا مطیع و فرمانبردار۔ لیکن وہی باپ جب بیٹے کا دست نگر ہو جاتا ہے تو بیٹے کا تابع فرمان ہو جاتا ہے۔ غریب دولتمند کا محتاج ہے۔ اس لئے خدمتگذار بھی ہے۔ شاگرد اُستاد کا محتاج ہے۔ لہٰذا استاد کا ہر قسم کا استبداد جائز ہی نہیں بلکہ ضروری سمجھتا ہے۔ لیکن یہ تمام حالتیں ایسی ہیں جن میں گردش و دلالی جاری ہے۔ کوئی شکل مستقل نہیں ہے۔ ہر ایک کیفیت تغیر پذیر ہے اور انسان چاہتا ہے حکومت مستقل تاکہ وہ اپنے جذبہ کی تسکین میں کبھی زیادہ دقت محسوس نہ کرے۔ انسان کی نوعی اور عمرانی زندگی میں ایک گوشہ ایسا ہے جہاں احتیاج کا یہ سلسلہ ناقابل تغیر ہے۔ یعنی مرد و عورت کے وظائف زندگی کی جو تقسیم فطرت کی طرف سے ہوتی ہے اس میں عورت اپنی زندگی کے بیشتر حصہ میں مرد کی حفاظت و کفالت کی محتاج رہتی ہے۔

حکومت طلب انسان کو یہ گنجائش خدا دے۔ اس نے عورت کے اس نازک پہلو سے ایسا فائدہ اُٹھایا کہ فطرت بھی اپنی ہنسی نہ تھام سکی ہوگی۔ چنانچہ آپ دیکھئے کہ ایک ایسا مرد جو باہر کی دُنیا میں ادنیٰ سے ادنیٰ انسان کا زیر فرمان ہو جب گھر کی چار دیواری میں قدم رکھے گا تو جذبہ حکومت کی تمام اُمنگیں ایک ایک کرکے اُبھرتی چلی آئیں گی۔ حتیٰ کہ وہ ایک مطلق العنان حاکم کی صورت اختیار کرے گا کہ جس کے فیصلے کی کہیں اپیل نہیں۔ اور جس کے حکم کی کوئی تاویل نہیں۔ جب یہ جذبہ آپ انفرادی طور پر محسوس کرتے ہیں تو اندازہ لگائیے کہ انسان نے بہیئت اجتماعی اپنے عہد طفولیت سے آج تک اس جذبہ کی تسکین کی خاطر عورت کو محکوم رکھنے کے لئے کیا کچھ تدابیر نہ کی ہونگی۔ تمدن۔ معاشرت عمرانیت۔ اقتصادیات۔ مذہب۔ رسوم۔ قانون۔ غرضیکہ ہر پہلو اور ہر گوشے سے مختلف زنجیریں پیدا کی گئیں جو مختلف ناموں سے عورت کو پہنائی گئیں۔ معتقدات کا غیر محسوس اثر سب سے گہرا نقش پیدا کرتا ہے۔ رفتہ رفتہ سوسائٹی میں عورت کا وجود نہایت گھناؤنا اور پست قرار پاگیا۔ ادنیٰ ترین مخلوق۔ بے روح انسان۔ منحوس ہستی۔ نوع انسانی کے تمام مصائب کی علت العلل۔ ہر ایک فتنہ و فساد کا بنیادی سبب۔ ناقص العقل۔ اشر المکائد غرضیکہ دنیا کا ہر معیوب خطاب اس کی طرف منسوب کیا گیا۔ نہ سوسائٹی میں اس کی پوزیشن ہے نہ کسی ملکیت میں اسکا حق ہے نہ کسی معاملہ میں اس کی کوئی رائے ہے۔ نہ کسی فیصلے میں اس کی بات کی کوئی وقعت ہے۔ یہ تھی وہ حالت جو انسانی استبداد نے اپنی ہی ہم جنس نوع کے ساتھ روا رکھ چھوڑی تھی لیکن فطرت کو یہ غیر فطری تقسیم کس طرح مرغوب ہوتی۔ وہ اس ظلم ناروا کو کب تک برداشت ہونے دیتی۔ چنانچہ خالق فطرت نے اپنا آخری پیغام انسانوں کی طرف بھیجا۔ اور اس میں کھلے کھلے الفاظ میں ظاہر کر دیا کہ تم نے نوع انسانی کی نصف آبادی کو غلامی کی جن بوجھل زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے یہ سراسر غیر فطری ہیں۔ ناروا ہیں۔ تمہارے جور و ستم کی زندہ مثالیں ہیں۔ تمہارے تسلط و تغلب کے ناخوش آئند جذبہ کی پائندہ داستانیں ہیں۔ یاد رکھو تمہاری تخلیق ایک نفس واحد سے ہوئی ہے۔ فرائض زندگی کا فرق صرف فطرت کے تقسیم عمل کا فرق ہے۔ اس سے آگے اور تمام امتیازات تمہارے اپنے پیدا کردہ ہیں جن کی تمہارے پاس کوئی سند نہیں۔ کوئی سلطان نہیں۔ کوئی دلیل نہیں۔ کوئی برہان

نہیں۔ لڑکی پیدائش کی گھڑی سے منحوس خیال کی جاتی تھی۔ قرآن کریم نے بالتصریح فرما دیا کہ یاد رکھو بیٹے اور بیٹیاں سب خدا کی دین ہیں۔ جسے چاہے بیٹے دے۔ جسے چاہے بیٹیاں دے۔ اس میں سعد ونحس کا کیا واسطہ۔ پھر باپ کے ہاں لڑکی کی پوزیشن خاندان کے مردوں کے رحم پر ہوتی تھی انگلستان کے قانون وراثت میں لڑکی کا ذکر ہی نہ تھا۔ ہمارے ہندوستان میں جو کچھ لڑکی کو دیا جاتا تھا وہ دان ہوتا تھا بطور استحقاق کے وہ کچھ نہیں لے سکتی تھی۔ قرآن کریم نے باپ کی وراثت میں لڑکی کا حصہ لازمی رکھا۔ اور وہ اسے بطور استحقاق وصول کر سکتی ہے۔ نکاح کے معاملہ میں تو لڑکی اپنی زبان تک نہ ہلا سکتی تھی۔ جیون بندھن اس کی پیدائش سے بھی پہلے کا مقدر ہوتا تھا اور مرنے کے بعد تک رہتا تھا۔ قرآن کریم نے نکاح کے بارے میں عورت کو پورا پورا اختیار دیا ہے۔ پھر نکاح کو ایک معاہدہ قرار دیا ہے ناقابل انفکاک "سیکرے منٹ" Sacrement نہیں کہا۔ جب تک باہمی تعلقات کی خوشگواری سے گھر جنت ارضی کا نمونہ بنا رہے۔ معاہدہ استوار ہے۔ لیکن اگر بعض حالات کے ماتحت اختلافات ایسے شدید و وسیع ہو جائیں کہ بنائے نہ بنے۔ تو بجائے اس کے کہ باقی عمر جہنم کی آگ میں بسر کی جائے مخصوص شرائط وقیود کے ماتحت اس معاہدہ کو توڑ دینے کی بھی اجازت دی گئی۔ گھر میں بیوی کی حیثیت ایک غلام کی سی نہیں۔ بلکہ رفیق حیات کی سی ہے۔ مشیر کار کی سی۔ کچھ حقوق مرد کے عورت کے ذمے ہیں۔ کچھ عورت کے مرد کے ذمہ ہیں۔ ان کی ادائگی۔ فرائض متعینہ کی بجا آوری۔ دونوں پر لازم ہے۔ دونوں میں سے جو بھی ان میں کوتاہی کرے۔ تساہل برتے۔ تغافل پر اتر آئے۔ قابل مواخذہ ہے۔ پھر شوہر کے ترکہ میں بیوی کا حصہ ہے۔ اس کے بعد بہ حیثیت ماں۔ اس سے حسن سلوک کا ارشاد ہے۔ احسان ومروت کا حکم ہے اور حکم بھی بڑا تاکیدی۔ پھر اولاد کے ترکہ میں بھی اس کا حصہ ہے۔ سوسائٹی میں اس کی شخصیت بجائے خویش مستقل ہے۔ انگلستان کے قانون ورواج کے مطابق شادی کے بعد عورت اپنا ذاتی تشخص بالکل کھو دیتی ہے۔ اس کی اپنی حیثیت خاوند کی حیثیت میں مدغم ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ اس کا اپنا نام بھی باقی نہیں رہتا۔ اس کا تعارف اس کے خاوند کی وساطت سے ہوتا ہے۔ برعکس اس کے اسلامی سوسائٹی میں عورت اپنا مستقل تشخص رکھتی

ہے جو اس سے کسی حالت میں بھی الگ نہیں ہوتا۔ اس سے اندازہ لگائیے کہ اسلام سے پیشتر عورت کی حیثیت کیا تھی۔ اور اسلامی شریعت نے اُسے کہاں سے کہاں ۔۔ پہونچا دیا۔ اور پھر خوبی یہ ہے کہ عورت کی حیثیت کو اتنا بلند کر دینے کے باوجود تقسیم عمل کے لحاظ سے جو فطری اختلاف عورت و مرد کے وظائف زندگی میں رکھا گیا ہے۔ اسے کہیں نظر انداز نہیں کیا گیا۔ یورپ ردعمل میں ہمیشہ متشدد رہا ہے۔ وہاں کی عورتوں نے اگر آج مردوں سے انتقام لینا چاہا ہے تو وہ "مساوات نوعی" کی دُھن میں یہ بھی بھول گئی ہیں کہ فطرت نے انکی تخلیق کا ایک مقصد رکھا ہے اور اس مقصد کی برآوری کے لئے انھیں نازک جذبات کا حامل بنایا ہے۔ عورت اس وقت تک عورت ہے جب تک وہ ان نازک حسیات کی مالک ہے ورنہ جس طرح ایک مرد زنانہ صفات و جذبات کی نقالی سے مرد نہیں رہتا۔ اسی طرح ایک عورت بھی مرد بننے کی ناکام کوشش میں اپنی مخصوص صفات کھو بیٹھتی ہے۔ عورت ہونا اور عورت ہی رہنا۔ کوئی ذلت کی بات نہیں۔ اس خصوصیت کو مٹانے کی ہوس فطرت کی تضحیک ہے۔ اگر اُسے ایک زمانہ سے مرد کے استبداد نے ٹھکرا رکھا ہے تو وہ آئیے اور دیکھے کہ اسلام کی تعلیم فطرت میں اسے کتنا بلند درجہ حاصل ہے۔ لہٰذا مرد و عورت کی تمیز اُٹھا دینے کے یہ تمام وقتی ہنگامے بیکار ہیں۔ حیا، رافت، محبت، نرم دلی، پرورش اولاد، عصمت، رفاقت وغیرہ عورت کی خصوصیات میں سے ہیں۔ یہ اس کے فطرت کی طرف سے عطیات ہیں۔ یاد رکھیے! جس نے فطرت کے قوانین کی خلاف ورزی کی وہ کوئی نوع ہو۔ کوئی قوم ہو۔ کسی ملک میں ہو۔ کسی زمانے میں ہو۔ فطرت اسے سزا دے کر رہے گی۔

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!

اِسلام اور جمہوریّت (ایک مسلمان)

یوں تو جس دن سے اسلام نے اپنے اوّلین گہوارہ سے قدم باہر نکالا اُسے قسم قسم کی طاغوتی مخالفتوں سے سابقہ پڑنا شروع ہوگیا۔ اسلیئے کہ "آدم" اور "ابلیس" کی تخلیق ساتھ ہی ساتھ ہوئی تھی۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ جس قوّت اور شدّت سے ابلیسانہ سازشیں اِس دَور میں اسلام کے خلاف مصروفِ پیکار ہیں۔ اِس سے پیشتر شاید ہی ایسا محاذ دیکھنے میں آیا ہوگا۔ بالخصوص اسلیئے کہ آج مخالفانہ قوتیں کچھ اس قسم کے دلکش اور حسین نقابوں میں رُوپوش اور ایسے مشفقانہ اور ناصحانہ خرقوں اور لبادوں میں ملبوس سامنے آتی ہیں کہ حق و باطل میں تمیز مشکل ہو جاتی ہے۔ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ "اسلام آزادی کا مذہب ہے"۔ بجا اور درست! لیکن اِس سے مفہوم کیا لیا جاتا ہے۔ یہ کہ انسان خدا کا منکر ہو۔ پکّا ملحد اور دہریہ بنجائے۔ یورپ کی مادّہ پرستی کو منتہائے نگاہ سمجھے۔ مذہب کی تضحیک اسکا شیوہ ہو۔ شعائرِ الٰہی کا استہزاء اسکا شعار ہو۔ یہ سب کچھ کرے۔ لیکن باینہمہ مسلمان کہلائے اور مُصر ہو کہ اُسے بہترین مُسلمان سمجھا جائے۔ اسلیئے کہ اسلام "آزادی" کا مذہب ہے۔ آواز اٹھتی ہے کہ "اسلام مساوات کا مذہب ہے"۔ اس میں کسے کلام ہے۔ لیکن اسکا مطلب یہ پیش کیا جاتا ہے کہ روس کی بالشوزم عین اسلام ہے۔ قرآن کریم میں عفو اور درگذری کو بھی صفات محمودہ میں شمار کیا گیا ہے۔ اس سے جھٹ اس نتیجہ پر پہونچ گئے کہ اسلام اہمسا کی تعلیم دیتا ہے۔ نبی اکرمؐ نے مدینہ کے یہودیوں سے معاہدہ کیا۔ اِس سے فوراً "متحدہ قومیّت" کے جواز کا فتویٰ لے آئے۔ حضورؐ نے ہجرت کے وقت ایک غیر مُسلم کو مدینہ کا راستہ دکھانے کے لیے متعین فرمایا۔ اِس سے گاندھی جی کی سیاسی امامت کی دلیل مل گئی۔ عربی کا ایک مقولہ "حب الوطن من الایمان" سن پایا۔ اس سے علی الاعلان یہ نظریہ پیش کر دیا کہ قومیتیں اوطان سے بنتی ہیں۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوا کہ

ہم نے مختلف زمانوں میں مختلف اقوامِ عالم کے اندر اپنے رسول بھیجے۔ اِس سے فوراً یہ کُلیہ قائم ہو گیا۔ کہ عالمگیر سچائیوں کے اعتبار سے تمام مذاہب (جس حالت میں وہ آج ہیں) بالکل برابر ہیں غرضیکہ ایک ایک غیر اسلامی نظریہ کو قرآن و حدیث کے الفاظ کا نقاب اُڑھا کر یکسر اسلامی اُصول و مبانی کی حیثیت سے پیش کیا جا رہا ہے۔ اور یوں کفر و باطل کی ان اسلام سوز آرزؤں کو ایک ایک کر کے پُورا کیا جاتا ہے۔ جو ایک عرصے سے خدا اور اُسکے دین کے دُشمنوں کے سینوں میں مچل رہی تھیں۔ "شرارِ بولہبی" کو حجازی فانوس میں رکھ کر اُسے "چراغِ مصطفوی" نام دیا جاتا ہے۔ اور اگر کوئی خدا کا بندہ اِس فانوسِ خیالی کو توڑ کر حقیقت کو بے نقاب کرنا چاہتا ہے تو کافرگری کے ترکشوں کے تیر چلوں پر چڑھا لیے جاتے ہیں۔ اور مُرتد سازی کی نیاموں سے تلواریں سونت لی جاتی ہیں۔ توبہ! توبہ!!

چنیں دَور آسماں کم دیدہ باشد — کہ جبریلِ امیں را دِل خراشد ؞
چہ خوش دیرے بنا کردند آنجا — پرستد مومن و کافر تراشد

یہ دَور ہماری سیاسی تحریکات کا پیدا کردہ ہے اور انہیں کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتا جا رہا ہے، اسی کا شاخسانہ ہے۔ وہ بحث جو آجکل ہمارے قومیت پرست "جاں نثارانِ ملت" کے قلوب و اذہان کے لیئے وجۂ صد پریشانی اور باعثِ ہزار کاوش بن رہی ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلے دنوں مسٹر جناح نے کہیں یہ کہہ دیا کہ ہندوستان کی موجودہ حالت کے بپیشِ نظر جمہوری نظامِ حکومت مسُلمانوں کے نقطۂ نگاہ سے قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ چونکہ مسٹر جناح کے اِس نظریہ کو تسلیم کر لینے سے ہندؤں کے وہ تمام مقاصد و عزائم جو رُام راج کی تشکیل و تمکین کے لیئے اُنکے تصوّرات کو مرکوز کیئے ہوئے رہیں۔ خاک میں ملجاتے ہیں۔ اسلیئے سب سے پہلے گاندھی جی۔ مہاتما یئت کا چولہ پہنے۔ رام نام کی مالا جپتے۔ واردھا کی کٹیا سے باہر نکلے۔ اور اپنی پوری شان "شیخ الاسلامی" کے ساتھ فرمایا کہ میں قرآن و سیرت کی روشنی میں علی وجہ البصیرت اِس حقیقت کبریٰ کا اعلان کرتا ہوں کہ مسٹر جناح کا یہ نظریہ یکسر اسلام کے خلاف ہے۔ وہ اتنا کہہ کر پھر کٹیا میں تشریف لے گئے۔ اور اپنے

چیلوں کو اشارہ کر گئے کہ ہاں اذرا زور سے۔ بس پھر کیا تھا نیشنلسٹ علماء کبار کا مقدس طائفہ ایک طرف سے یلغار کر کے آگیا۔ "شری بیت" قسم کے مسلمان دوسری طرف سے امنڈ آئے۔ اور ملک میں ایک شور برپا کر دیا گیا کہ:۔

اسلام جمہوریت کا مذہب ہے

جناح کا یہ نظریہ سرتاپا اسلام کے خلاف ہے!

ہم یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے اور دل میں کہہ رہے تھے کہ یا اللہ تو اپنے دین کا آپ ہی رکھوالا ہے اگر ان لوگوں کے بس میں ہو تو نہ معلوم کیا سے کیا کر دیں۔

ہمیں اعتراف ہے کہ مسٹر جناح کا ہر قول قرآنی نظریہ کی سند نہیں ہو سکتا۔ اور انھوں نے خود بھی کبھی اس امر کا دعویٰ نہیں کیا کہ وہ اسلامیات کے ماہر اور کتاب و سنت کے عالم ہیں۔ لیکن یہ اللہ کی دین ہے کہ اُسنے اس خلفشار کے زمانہ میں ملتِ اسلامیہ کے اِس حقیقی دردمند کی نگاہوں کو وہ بصیرت عطا فرما دی ہے کہ وہ اپنی فطرتِ صالحہ کی مدد سے احوال وظروف کے مطالعہ کے بعد جس نتیجہ پر پہنچتے ہیں، وہ بالعموم قرآن کی تعلیم کے مطابق ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ اس کی سند میں قرآن کی کوئی آیت یا رسول اللہؐ کی کوئی حدیث نہ بھی پیش کر سکتے ہوں لہٰذا یہ دعوےٰ کہ چونکہ یہ خیال ایک "مسٹر" کی طرف سے پیش کیا گیا ہے، قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ حجت اور سند صرف وہی نظریہ ہو سکتا ہے جو کسی "مولانا" کی مُہرِ تصدیق سے منصۂ شہود پر آئے۔ خالص برہمنیت ہے۔ مجرّد قول نہ کسی مسٹر کا حجت ہو سکتا ہے نہ کسی مولانا کا بلکہ صرف وہ جس کو خدا اور اسکے رسولؐ کی بارگاہ عالیہ سے سند عطا ہو جائے۔ آیئے ہم دیکھیں کہ مسٹر جناح نے کیا کہا اور اسلام کا اس باب میں کیا فیصلہ ہے۔ حق تو یہ ہے کہ یہ وہ اہم مسئلہ تھا جس کی توضیح کے لیے آنکھیں رہ رہ کر اس مردِ حق آگاہ کو ڈھونڈھتی ہیں جو شاہی مسجد لاہور کے ایک گوشے میں محوِ خواب ہے۔ لیکن .....

"اسلام جمہوریت کا مذہب ہے"۔ لاریب فیہ۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس جمہوریت کے معنے کیا

ہیں جسکا علمبردار اسلام ہے۔ کیا وہ یہی جمہوریت ہے جو مغرب کی ٹکسالوں سے نکلکر دُنیا کے بازاروں میں دراہم کاسدہ کی طرح ماری ماری پھرتی ہے۔ یا اس سے کچھ الگ۔ جب تک یہ بنیادی مسئلہ طے نہیں ہوجاتا یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی۔ کہ مسٹر جناح نے کیا کہا ہے۔ اور اُنکے اعلان کی مخالفت کرنے والے قوم کو کدھر لیئے جارہے ہیں۔

مروجہ جمہوری نظامِ حکومت کے معنیٰ یہ ہیں کہ عوام اپنے نمائندے منتخب کریں۔ اور ان نمائندگان کی کثرتِ آرا سے تمام اُمور کا فیصلہ ہوا کرے۔ اور یہ فیصلے مُلک میں قانون کی حیثیت سے نافذ کیئے جائیں۔ اِس نظامِ حکومت میں پہلا مرحلہ "انتخاب" کا ہے۔ چونکہ اُمیدواران اور رائے دہندگان دونوں کے پیشِ نظر معیارِ فضیلت جوہر ذاتی نہیں۔ بلکہ مختلف قسم کے دیگر رجحانات ہوتے ہیں۔ اِس لیئے معرکۂ انتخاب میں جو کچھ ہوتا ہے اور جس قسم کے نمائندے انتخاب میں کامیاب ہوکر آتے ہیں۔ اس کی حقیقت ہر اُس شخص کے سامنے ہے۔ جس کی نگاہ ہماری مختلف مجالس اور انکے عناصرِ ترکیبی پر ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ طریقِ انتخاب میں اصلاح ہوسکتی ہے۔ اور ایسی صورتیں پیدا کی جاسکتی ہیں۔ جن سے بہترین نمائندے ہی منتخب ہوا کریں۔ ہم اِسوقت اِس بحث میں نہیں اُلجھنا چاہتے۔ کہ جس قسم کا ماحول مغربی نظامِ زندگی نے پیدا کردیا ہے۔ اس میں اس قسم کی اصلاح کی کس قدر گنجائش ہے ہم تو صرف ان نتائج سے بحث کررہے ہیں۔ جو اِس نظامِ زندگی سے آج کل پیدا ہورہے ہیں جب مغربی نظامِ انسانیت کو اتنی بلندی پر لے جائیگا۔ کہ عوام اپنے قلبی اور ذہنی رجحانات اور مادّی مفاد پر حقائق کو ترجیح دینے لگ جائیں۔ یہ اسوقت دیکھا جائیگا۔ اِسوقت نظامِ جمہوریت کی دوسری شق کو لیجیے۔ یعنے کثرتِ آرا۔ مثال کے طور پر یوں سمجھیے کہ اگر کسی مجلسِ قانون ساز میں یہ مسئلہ پیش ہو کہ خدا کا وجود ہے یا نہیں۔ اور (۵۱) اراکین کی رائے نفی کی طرف ہو تو (۴۹) اراکین کو ماننا پڑے گا کہ (نعوذ باللہ) خدا کا وجود نہیں ہے۔ ہر چند خدا کی ہستی پر انکا ایمان ہو۔ اگر وہ ملک کے اس فیصلہ کے خلاف جو قانونی حیثیت اختیار کرچکا ہوگا اپنے ایمان پر قائم رہیں تو وہ قانون کی نگاہ میں مجرم ہونگے

اور مستوجب سزا۔ یہ ہے مغرب کا وضع کردہ نظامِ جمہوریت۔ کہئے کہ اس نظام کی روسے اقلیت یہ دعوے کرسکتی ہے کہ اُسے آزادی حاصل ہے اِس نظام میں اقلیّت کی کیا حالت ہوگی۔ یہ ہم سے نہیں۔ پنڈت جواہرلال نہرو سے سینئے۔ فرماتے ہیں :۔

"دراصل جمہوری حکومت کے معنے یہ ہیں کہ اکثریت اقلیت کو ڈرا کر اور دھمکا کر اپنے قابو میں رکھتی ہے" (میری کہانی جلد دوم صفحہ ۴۵۵)

حتّٰی کہ گاندھی جی لکھتے ہیں کہ "نظام جمہوری میں اقلیتوں کو کسی نہ کسی حد تک غیر مطمئن رہنا ہی پڑے گا" (اسٹیٹس مین ۱۱ ؍ ۷) اور گاندھی جی کے یہ الفاظ ان دنوں کہے جا رہے ہیں۔ جب کہ انہیں ضرورت ہے کہ اقلیتوں کو یقین دلائیں کہ "آزاد" ہندوستان میں انپر کسی قسم کا جور و استبداد نہیں ہوگا۔ اسی لئے ذرا دبی زبان سے اس امر کا اقرار ہو رہا ہے۔ کہ نظامِ جمہوریت میں اقلیت کو کس حد تک آزادی ملتی ہے۔ یہ ہے مغرب کا جمہوری نظام!

اب ذرا اِس نظامِ حکومت کو ہندوستان کے موجودہ احوال وظروف پر منطبق کرکے دیکھئے کہ نتیجہ کیا برآمد ہوتا ہے۔ پہلا مرحلہ طریقِ انتخاب کا ہے۔ اگرچہ آج کل یہ طریق جُداگانہ انتخاب (Separate electorates) کا ہے لیکن ظاہر ہے کہ آزاد ہندوستان میں سب سے پہلا قانون یہی پاس ہوگا کہ طریق انتخاب مخلوط (Joint electorates) ہونا چاہیئے۔ اسلئے کہ جُداگانہ انتخاب۔ متحدہ قومیت کی تشکیل میں سدِّراہ ہے۔ بہرحال طریقِ انتخاب کچھ بھی ہو یہ ظاہر ہے کہ مجالسِ قوانین ساز اور حکومت کے دوسرے شعبوں میں مسلمان بہرکیف اقلیت میں ہونگے۔ اور چونکہ اس نظام کی رُو سے فیصلے اکثریت کی آراء کے مطابق ہونگے۔ اسلئے ہوگا وہی جو ہندوؤں کی اکثریت چاہے گی۔ یہ ایک ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ہر وہ شخص جسے اللہ نے تھوڑی سی بصیرت عطا کی ہے۔ اسے بے نقاب دیکھ سکتا ہے۔

اب ہم پوچھتے ہیں گاندھی جی اور ان کی پُوری جماعت سے۔ جن میں ہمارے نیشنلسٹ علماء حضرات بھی شامل ہیں۔ کہ کیا یہ نظامِ حکومت ایسا ہے جسے اسلام کے ساتھ کہیں دُور کا بھی

تعلق ہو۔ ہم چیلنج دیتے ہیں قومیت پرست علما کے پورے گروہ کو کہ کتاب وسنت وآثار سے کوئی ایک سند ایسی پیش کریں۔ جس کی رُو سے اسلام اپنے متبعین کے لیے اس قسم کے نظامِ حکومت کے ماتحت زندگی بسر کرنے کا نام آزادی قرار دیتا ہو۔ حیرت ہے کہ ان حضرات کی بصیرت وفراست کو کیا ہوگیا؟ انکے نزدیک کوئی شخص اکیلا ڈاکہ ڈالے تو وہ مجرم ہے۔ انسانیت کا دُشمن ہے لیکن اگر ڈاکوؤں کی جماعت ملکر کثرت رائے سے کہیں ڈاکہ ڈالیں۔ تو یہ ڈاکہ (نعوذ باللہ) عین اسلام کے مطابق ہے۔ اس لیے کہ یہ ڈاکہ جمہوری نظام کے ماتحت واقع ہوا ہے۔ انکا خیال ہے کہ اگر دو آدمیوں کے مقابلہ میں ایک آدمی، دو اور دو پانچ کہے تو یہ غلط ہوگا۔ لیکن اگر پانچ آدمی یہی کہہ دیں تو پھر یہ بالکل صحیح ہوجائیگا۔ اسلیئے کہ اب اُسے جمہوریت کی سند حاصل ہوجائے گی۔ اگر کسی مسئلہ کی صحت کے لیے یہی سند کافی ہے کہ اکثریت اُسکے حق میں ہے تو آپ حضرت عیسٰی علیہ السّلام کو خدا کا بیٹا یا خود خدا ماننے والوں کے مسلک کی تردید کیوں کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ اکثریت میں ہیں۔ دُور کیوں جایئے۔ خود ہندوستان میں مسلمان اقلیت میں ہیں۔ ہندو اکثریت میں۔ اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ حق وہی ہے۔ جسے اکثریت کی حمایت حاصل ہو تو پھر ہندوؤں کو حق پر ماننا پڑیگا۔ ممکن ہے آپ کہہ دیں کہ یہ تو مذہب کے معاملات ہیں۔ نظامِ حکومت سے اُنہیں کیا واسطہ! لیکن سوال یہاں مذہب اور حکومت کے شعبوں کا نہیں بلکہ اس بنیاد کا ہے جسپر جمہوری نظام کا نظریہ قائم ہے۔ اور وہ بنیاد یہ ہے کہ اکثریت اقلیت کے مقابلہ میں برسرِ حق ہوتی ہے، یہ بنیاد ہی غلط ہے۔ اور جب بنیاد ہی غلط ہے تو جسقدر عمارت اسپر تعمیر ہوگی سب غلط ہوگی۔ خواہ اس میں حکومت کا کمرہ الگ ہو۔ اور مذہب کا الگ۔

اب اسلام کیطرف آیئے۔ سوال کیا جاتا ہے کہ اسلام میں نظامِ حکومت۔ جمہوریت ہے، یا آمریت؟ اور سوال کرتے وقت جمہوریت اور آمریت سے ذہن میں وہ نظام ہوتا ہے جو یورپ کی پیداوار ہے۔ لہٰذا اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اسلام کا نظامِ حکومت نہ وہ جمہوریت ہے جو آج کل مروّج ہے نہ وہ آمریت۔ اسلام ان نظام ہائے حکومت سے جو ذہنِ انسانی نے وضع کیے ہیں۔ بالکل الگ

جُداگانہ اور مخصوص نظامِ حکومت کا پیامبر ہے اور یہی وہ فرق ہے جسے نظر انداز کر دینے سے اسلام کے متعلق غلط تصورات ذہن میں قائم کر لیے جاتے ہیں۔ جمہوریت سے مُراد یہ ہے کہ حکومت کا اختیار اکثریت کو حاصل ہوتا ہے۔ اور آمریت سے مفہوم یہ ہے کہ یہ اختیار ایک فردِ واحد کی ذات میں مرکوز ہوتا ہے۔ لیکن اسلام میں حکومت کا اختیار نہ اکثریت کو حاصل ہے نہ ایک فرد کو، وہاں حکومت کا اختیار انسانوں سے بلند و بالا ایک ذات کو حاصل ہے، جسے خدا کہتے ہیں ان الحکم الا للہ (حکومت کا اختیار صرف خدا کو حاصل ہے) اسلام کا بنیادی اُصولِ حکومت ہے۔ خدا کے سوا کسی اور میں حکومت کے اختیار کا عقیدہ اُسکے نزدیک شرک ہے اُسکے نزدیک ؎

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی۔ باقی بتانِ آذری

حکومت، قوانین کے ذریعے قائم ہوتی ہے۔ اور ان قوانین کے اُصول وضوابط اللہ تعالیٰ نے خود مرتب فرما کر اپنی زندہ جاوید کتاب میں محفوظ کر دیے ہیں۔ اسلیئے تمام اُمور کے فیصلے اِس ضابطۂ خداوندی کے ماتحت ہونگے جو ایسا نہ کریگا وہ حکومتِ الٰہی کا انکار کرنیوالا ہوگا۔

ومن لم یحکم بما انزل اللہ ۔ فاولئک ھم الکافرون ۔ (۵/۴۴)

(جو کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے۔ وہ لوگ انکار کرنیوالوں میں سے ہیں!)

ان قوانین کی تنفیذ انسانوں کے ہاتھ سے ہوگی اور انسانوں کا وہ گروہ جو ان کی تنفیذ کا ذمہ دار ہوگا۔ حزب اللہ۔ یا ملتِ اسلامیہ کہلائیگا۔ یہی وہ جماعت ہے جو کتاب اللہ کی وارث قرار دی گئی ہے۔ قرآن کریم میں قوانینِ الٰہیہ چونکہ اصولی اور اساسی شکل میں ہیں، اسلیئے اِس جماعت کا کام یہ ہوگا کہ ان اصولوں کی روشنی میں اپنے اپنے زمانہ کے احوال وظروف کے مطابق جزئیات و فروعات کو ترتیب دے اور اسکے بعد ان قوانین کو دُنیا میں نافذ کر دے۔ اِن مقاصدِ عالیہ کو بروئے کار لانے کے لیئے ایک نظامِ عمل (نہ کہ نظامِ حکومت۔ باصطلاحِ مروجہ) کی ضرورت ہے۔ یہ نظام جیسا کہ کتاب و سنت و آثار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے، نہ تو خالصتہً جمہوریت ہے نہ آمریت بلکہ

ان کو سمویا ہوا سا ہے۔ یعنی ان کی خوبیاں اس نظام میں موجود ہیں۔ اور ان کی بُرائیوں سے یہ منزہ ہے۔ صحیح جمہوریت اور آزادی کے لیے مساوات اور اخوت مقدم ہے۔ اور مساوات اور اخوت اسلام کی روح ہے۔ یہی اس نظام کے رگ وپے میں جلوہ فرما ہے۔ امیر کا انتخاب اس اصول پر ہوگا۔ اور معیار فضیلت فقط "تقویٰ" ہوگا کہ یہ معیار خود ضابطۂ خداوندی کا متعین فرمودہ ہے۔ (ان اکرمکم عند اللہ اتقکم) اُمّت کے بہترین افراد اس امیر کی مجلسِ مشاورت کے اراکین منتخب کیے جائینگے۔ اور انکا انتخاب بھی تقویٰ اور مساوات کے معیار پر ہوگا۔ جملہ اُمور میں مشورہ ضروری ہوگا کہ (امرھم شوریٰ بینھم) اُنکے خدا کا حکم ہے۔ لیکن باہمی مشاورت میں قرآن کریم کے اُصول وضوابط کی روشنی ہر مقام پر اُنکے لیے خضرِ راہ ہوگی۔ نہ امیر اس سے اِدھر اُدھر ہوسکے گا۔ نہ اس کی مجلس شوریٰ۔ معاملات زیرِ نظر کے بہت سے ایسے گوشے جو ایک انسان کی نگاہوں سے اوجھل ہوسکتے ہیں۔ باہمی مشاورت سے ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ اور یوں آخری فیصلہ تک پہنچنے میں بڑی آسانی ہوجاتی ہے۔ بایں ہمہ امیر اکثریت کی رائے پر مجبور نہیں ہوگا۔ پابندی صرف قرآنی اصول کی ہوگی چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سامنے جب مُرتدین کے خلاف چارہ جوئی کا سوال آیا تو جماعت صحابہؓ میں سے ہر شخص کی یہی رائے تھی کہ انکے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا جائے لیکن آپ کی رائے انکے خلاف تھی۔ چنانچہ آپنے اپنی رائے کے مطابق انکے خلاف جہاد کا فیصلہ کیا۔ اور صحابۂ کبار کو تسلیم کرنا پڑا کہ فی الواقعہ وہی فیصلہ منشائے کتاب اللہ کے مطابق تھا۔ اُسکے برعکس یہ منظر بھی ہمارے سامنے ہے کہ حضرت عمرؓ فاروق کی رقوم پر کچھ پابندیاں عائد کرنا چاہتے تھے لیکن مجمع میں سے ایک غریب بڑھیا اُٹھ کر آپ کی توجہ قرآن کریم کی ایک آیت کی طرف منعطف کراتی ہے۔ اور آپ فوراً اپنا خیال ترک کر دیتے ہیں۔ ہم اسوقت اسلامی نظامِ حکومت کی تفصیلات سے بحث نہیں کرنا چاہتے۔ صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اُصولی طور پر ایسا نظامِ جمہوریت سے بالکل مختلف ہے جو یورپ کا وضع کردہ ہے۔ اسلامی نظامِ جمہوریت میں قوانین کے اُصول وضوابط پہلے سے متعین ہیں صرف ان کی جزئیات کی ترتیب باقی رہتی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ان جزئیات میں اگر بہ تقاضائے بشریت

غلطی بھی ہو جائے تو وہ ایسی خطرناک نہیں ہوتی جتنی اُصول کی غلطی۔ لہٰذا اسلام کے نزدیک صرف وہ نظامِ زندگی قابلِ قبول ہو سکتا ہے جسکا مقصد وحید دُنیا میں قوانینِ الٰہیہ کی تنفیذ و ترویج ہو۔ اور بس۔ اور یہ مقصد کبھی اس جمہوریت سے حاصل نہیں ہو سکتا جس میں فیصلے اکثریت کی آراء کے مطابق ہوں اور اکثریت غیر مسلموں کی ہو۔ اب آپ کہیئے کہ وہ نظامِ حکومت جسے ہندوستان میں قائم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اور اس کوشش کا نام آزادی کے لیئے جہاد قرار دیا جاتا ہے۔ کس طرح مسلمانوں کے لیئے قابلِ قبول ہو سکتا ہے۔ مُسلمان کے لیئے مقدم شئے اُصولِ حکومت Principle of Government ہے۔ ہیئت حکومت Form of Government کا سوال بعد میں پیدا ہوتا ہے۔ جب اُصولِ حکومت وہ نہیں جو قرآن کریم کا متعین فرمودہ ہے، تو ہیئتِ حکومت جمہوریت ہو یا ملوکیت۔ دونوں ناقابلِ قبول ہیں۔ مُسلمان کے نزدیک قوانینِ خداوندی۔ قوانینِ فطرت کی طرح اٹل اور غیر متبدل ہیں۔ اور دُنیا کی کوئی طاقت ان میں ردّ و بدل کرنیکا اختیار نہیں رکھتی۔ خواہ وہ طاقت چنگیز خاں کی ہو یا ہٹلر کی۔ وائٹ ہال کی ہو یا واردھا کی۔ جب تک مُسلمان کو یہ حیثیت حاصل نہیں ہوتی۔ وہ اپنے آپ کو آزاد نہیں کہہ سکتا۔ دُنیا کے پاس چونکہ ایسا ضابطۂ خداوندی نہیں۔ اسلیئے وہ نظامِ حکومت کی مختلف شکلیں اپنے ذہن سے وضع کرتے رہتے ہیں کبھی ایک قسم کا نظام قائم کیا۔ پھر اس سے تنگ آ گئے تو کوئی دوسری صورت تجویز کر لی۔ وہ ناکام ثابت ہوئی تو کسی اور طرف چل پڑے۔ جب یہ حالت آزاد اقوامِ عالم کی ہو رہی ہے تو غلام قوموں کا تو پُوچھیئے ہی نہیں۔ خود ہندوستان میں دیکھیئے کہ یہ غلام آبادیٔ یورپ کی چھوڑی ہوئی ہڈیوں کی طرف کس طرح لپک کر جاتا ہے۔ جس طرح ہندوستان کے بازاروں میں یورپ اور امریکہ کے اُترن کوٹوں کا استقبال یہاں کے مادّی افلاس کی پردہ دری کرتا ہے۔ اسی طرح وہاں کے اُترن نظریوں کا رواج یہاں کے ذہنی افلاس کی غمازی کرتا ہے۔ لیکن افسوس ہے مسلمانوں پر کہ اُنکے پاس قوانین الٰہی کا ایسا درخشندہ اور تابناک ضابطہ موجود ہے۔ اور یہ دوسروں سے بھیک کے ٹکڑے مانگتے پھر رہے ہیں۔

پھر کہا جاتا ہے کہ جب ہندوستان کے نظامِ جمہوریت میں اقلیتوں کو اُنکے مذہب کے تحفظ کی ضمانت دی جاتی ہے۔ تو پھر مسلمانوں کو اس نظامِ حکومت پر اعتراض کیا ہو سکتا ہے۔ یہ ایک ایسا سادہ اور پُرکار حربہ ہے کہ بڑے بڑے دیدہ ور اسکا نشانہ بنکے رہ جاتے ہیں۔ حالانکہ اگر ذرا نگہ دُور رس سے دیکھا جائے تو حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ مشکل یہ ہے کہ دُنیا کے نزدیک مذہب محض چند رسوم اور عبادات کا نام ہے۔ اُنکے علاوہ اور سب کام "دُنیاوی شعبہ" میں آجاتے ہیں۔ چنانچہ ابھی پچھلے دنوں گاندھی جی نے پھر اس بات کا اعادہ کیا ہے کہ مُسلمان آزادی سے نماز پڑھیں۔ روزے رکھیں، عیدین منائیں۔ انہیں کوئی نہیں روکے گا۔ یہ اِس سے زیادہ اور کیا تحفظ چاہتے ہیں۔ اور یہ وہ گاندھی جی ہیں۔ جنہیں خیر سے یہ دعویٰ ہے کہ میں نے قرآن[1] بھی پڑھا ہے اور سیرت کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ لیکن انھیں کون سمجھائے کہ اسلام کے نزدیک مذہب کا دائرہ عبادات و رسوم سے کہیں وسیع تر ہے۔ اس میں دین اور دُنیا۔ چرچ اینڈ سیٹ دو مختلف شعبے نہیں ہیں۔ بلکہ ایک ہی کپڑے کے تانے بانے ہیں۔ اسلامی نظامِ زندگی میں مذہب کی حیثیت ایسی ہی ہے جیسی نظامِ جسمانی میں سانس کی۔ کہ بظاہر اسکا تعلق صرف پھیپھڑوں سے معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اعضاء و جوارح میں سے ہر ایک کی زندگی کا دارومدار اسی پر ہے۔ اسلام میں زندگی کا کوئی معاملہ ایسا نہیں جو مذہب کی حدود میں نہ آتا ہو۔ پیدا ہونے سے مرنے تک ایک مسلمان کی زندگی کا ہر لمحہ۔ انفرادی ہو یا اجتماعی۔ مذہب سے وابستہ ہے اسلیئے اس امر کی ضمانت بالکل بے معنے ہے۔ کہ مسلمانوں کو "مذہبی معاملات" میں پُوری آزادی حاصل ہوگی۔ اور نظامِ جمہوریت صرف "غیر مذہبی معاملات" پر حاوی ہوگا۔ اسلام میں اس قسم کی تقسیم کا تصور ہی باطل ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کے نزدیک نظامِ حکومت صرف وہی قابلِ قبول ہو سکتا ہے۔ جس میں اُنکے تمام اُمور قوانینِ الٰہیہ کی روشنی میں طے پائیں۔ اور یہ اسی صُورت میں ممکن ہے کہ انکی اپنی جماعت ہو۔ اپنا امیر ہو۔ اپنا قانون ہو، اپنی حکومت ہو۔ ہندوستان میں اس کی ایک ہی

---

[1] غالباً مولانا آزاد کی وہ تفسیر پڑھی ہوگی جسکا ہندی ترجمہ کانگرس کی طرف سے شائع ہوا تھا۔

عملی شکل ہوسکتی ہے کہ مسلم انڈیا کو باقی حصۂ ملک سے الگ کردیا جائے اسکے علاوہ بحالت موجودہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آزادی کی کوئی صورت نہیں۔ جب مسلمان کو اس قسم کی آزادی حاصل ہوگی تو یہ اسوقت بتا سکے گا کہ کس قسم کا نظام حکومت انسانیت کی سرفرازی و سربلندی کا موجب ہوسکتا ہے، کہا جا سکتا ہے کہ مسلم انڈیا میں جو غیر مسلم اقلیتیں ہوں گی ان کی مذہبی آزادی کا تحفظ کس طرح ہوسکے گا۔ لیکن یہ مسئلہ بالکل واضح ہے، جیسا کہ ہم نے ابھی ابھی لکھا ہے، اسلام کے سوا تمام ادیانِ عالم میں مذہب کا دائرہ صرف چند عبادات و رسوم تک محدود ہے۔ اسلیئے اِن مذاہب کے متبعین کے لیئے مذہبی آزادی کی ضمانت کچھ مشکل نہیں۔ غیر مذہب کی عبادتگاہوں کا تحفظ تو از روئے قرآن کریم مسلمانوں پر ضروری ہے۔ اسلیئے مسلم اکثریت کے علاقوں میں غیر مسلم اقلیت کو اپنے مذہب کی آزادی کے بارے میں کوئی شکایت نہیں ہوسکتی۔ مسلمان ہر مذہب والے کو تحفظ کی ضمانت دے سکتا ہے۔ لیکن دنیا کی کوئی حکومت۔ مسلمان کو مذہبی تحفظ کی ضمانت نہیں دے سکتی۔ مسلمان کا مذہبی تحفظ صرف اِسی صورت میں ممکن ہے کہ حکومت ان کی اپنی ہو کہ یہاں مذہب اور حکومت دو مختلف چیزیں نہیں ہیں۔ دوسرا سوال یہ رہ جاتا ہے کہ غیر مسلم اکثریت کے علاقہ میں جو مسلمان باقی رہ جائینگے انکا نظامِ زندگی کیا ہوگا۔ سو ظاہر ہے کہ ان کی یہ حالت بالکل اضطراری ہوگی۔ اگر انہیں اسلامی نظامِ حکومت کے ماتحت زندگی بسر کرنا مقصود ہوگا تو انھیں اپنی اضطراری حالت سے جتنی جلدی ہوگا چھٹکارا حاصل کرکے مسلم اکثریت کے علاقوں میں آجانا ہوگا، کہ غیر مسلم حکومت کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر قناعت کرجانا۔ اسلامی زندگی نہیں قرار دیا جاسکتا۔ البتہ اسلامی حکومت کے ایک فرد کی حیثیت سے وہ دنیا میں کہیں رہے۔ جب تک اسکا رشتہ اپنے مرکز سے جڑا ہوا ہے۔ اس کی پوزیشن بڑی ممتاز ہوگی۔ یہ ہے ہندوستان میں مسلمانوں کا مطمح نگاہ اور یہی نصب العین کا حصول ہماری آزادی ہے۔ البتہ اس منتہیٰ تک پہنچنے کے لیئے ہمیں مختلف مراحل سے گزرنا ہوگا۔ اور ان مراحل میں جو کچھ ہم حاصل کرتے جائیں غنیمت سمجھنا چاہیئے۔ ہم پہلی جست میں اس منتہیٰ تک نہیں پہنچ سکتے البتہ ہمیں اس امر کا یقین کرلینا چاہیئے۔ کہ ہمارا ہر قدم اِسی نصب العین کی طرف اٹھ رہا ہے۔ اور یہی راستہ ہے جو آج

آئینی جدوجہد میں مسٹر جناح کے پیشِ نظر ہے ۔

اب آپنے مُلاحظہ فرمالیا کہ مسلمانوں کے نزدیک وہ نظامِ جمہوریت جسے ہندو یہاں قایم کرنا چاہتے ہیں۔کیوں نا قابلِ قبول ہے۔ہم تو سمجھتے ہیں کہ فقط اتنی بات کہ ہندو اِس طرزِحکومت کی اس قدر حمایت کررہا ہے اس امر کی کافی دلیل ہے کہ یہ طرز مسلمانوں کی ملّی خودکشی کا باعث ہوگا اسلیئے کہ قرآن کریم کا واضح ارشاد ہے (ودوماعنتم) یہ تو صرف اس چیز کی خواہش کرینگے جس سے تمہیں نقصان پہنچے۔یہ تمہارے فائدے کی کبھی سوچ ہی نہیں سکتے۔اسلیئے اگر یہ کبھی یہ بھی کہیں کہ فلاں نظریہ بالکل اسلامی ہے تم اسے اختیار کیوں نہیں کرتے تو بھی مسلمان کو ہزار مرتبہ سوچنا چاہیئے کہ اِس میں کیا راز ہے۔کہتے ہیں کہ ایک دفعہ شیطان ایک خضر صورت بزرگ کی شکل میں ایک عابد و زاہد کے پاس گیا اور اُسکے سامنے پاپیادہ حج کرنے کے اتنے فضائل بیان کئے کہ وہ شخص حج کے لیئے آمادہ ہوگیا۔ایک دوسرے بزرگ تھے جنہیں معلوم تھا کہ یہ ناصحِ مشفق کون ہیں۔اُنہوں نے شیطان سے پوچھا کہ تیرا کام تو ہمیشہ نیکی سے بہکانا ہے، آج خلافِ مسلک اس بزرگ کو حج پر کیوں آمادہ کیا جارہا تھا۔اسنے کہا کہ مینے مسلک تو نہیں چھوڑا۔جو کچھ مینے کیا بالکل ٹھیک تھا۔مجھے معلوم ہوا تھا کہ اسلامی لشکر جہاد کی تیاری کررہا ہے اور جو لوگ اِدھر اُدھر عبادتگاہوں میں معتکف بیٹھے ہیں انہیں دعوتِ جہاد دے رہا ہے۔اسلیئے مینے یہ مناسب سمجھا کہ ایسے لوگوں کو پاپیادہ حج کے لیئے روانہ کردوں تاکہ یہ جہاد میں شامل نہ ہوسکیں۔کچھ اسی قسم کے ناصحانہ مشورے ہیں ہمارے ان برادرانِ وطن کے جو قرآن وسیرت کے مطالعہ کا دعوےٰ کرکے مسلمانوں کو انکا بھولا ہوا سبق یاد دلاتے ہیں کہ جمہوری نظامِ حکومت عین اسلامی نظام ہے، جو مسلمان اِس سے انکار کرتا ہے قابلِ دار ہے لیکن ہمیں ہندوؤں پر افسوس نہیں۔اسلیئے کہ انکا تو مطمحِ نگاہ ہی مسلمانوں کی تخریب ہے افسوس ہے ان مسلمانوں پر جو گاندھی جی کی نفیری بنکر اُنکے راگ کو محراب ومنبر اور مازنہ و مکبرہ سے اونچے اونچے سُروں میں الاپنا شروع کردیتے ہیں، اور نہیں سوچتے کہ ہم ملّتِ اسلامیہ کو تباہی و بربادی کے کس جہنم کی طرف لیئے جارہے ہیں۔اور پھر قیامت یہ ہے کہ اپنے ان ملت کش نظریوں

کی تائید میں کتاب و سُنت کو مسخ کرنے سے بھی نہیں شرماتے کتنی بڑی ہے یہ جرات اور کتنی زبردست ہیں وہ مصلحتیں جو انھیں اس جرائت پر آمادہ کر دیتی ہیں۔ (لیشترون بایات اللہ ثمنا قلیلا)۔ حیرت ہے کہ یہ حضرات اگر کتاب و سُنت کی طرف سے آنکھیں بند کیے بیٹھے ہیں تو کیا روزمرہ کے واقعات بھی اُنکے سامنے نہیں آتے۔ ان سے کہئیے کہ ذرا اپنے کانگرسی آقاؤں سے اتنا تو پوچھیں کہ اگر نظامِ جمہوریت ہندوستان کے لیے بہترین نظام ہے تو آج جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں یہی نظام انھیں کانٹے کی طرح کیوں کھٹکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ موجودہ دستور و آئین کی رُو سے پنجاب اور بنگال میں بھی وہی نظامِ حکومت رائج ہے۔ جو یُو۔پی اور بمبئی میں ہے (وزارتی استعفوں سے پیشتر سے مراد ہے) اور یہ نظام کم و بیش جمہوری نظام ہی ہے۔ یو۔پی اور بمبئی میں چونکہ ہندوؤں کی اکثریت ہے اسلیئے وہاں یہ نظام آسمانی سمجھا جاتا ہے۔ اور جب بنگال اور پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت نظر آتی ہے تو وہی نظام یہاں مردود بنجاتا ہے۔ اگر جمہوری نظام نعمت ہے تو یہی بنگال میں لعنت کیوں بنجاتی ہے؟ اور ہر کانگرسی ایڑی سے چوٹی تک کا زور کیوں لگاتا ہے کہ اس نظام کو اُلٹ کر اکثریت ان کی پیدا کی جائے جو کانگرسیوں کے ہم خیال ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ خود کانگرسی حضرات کے نزدیک بھی محض جمہوری نظام کوئی قابلِ قدر شئے نہیں۔ وہی نظامِ جمہوریت قابلِ قبول ہے جس میں اکثریت ان کی اپنی ہو۔ لیکن کانگرس وہی کچھ کہے تو حق و صداقت ہے۔ اور مسلمان وہی کچھ کہیں تو ضد اور تعصب؛ یہ ہے ہماری موجودہ سیاست! مسلمان بھی یہی کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک مجوزہ نظامِ جمہوریت اسلیئے قابلِ قبول نہیں کہ اس میں اکثریت ان کی ہوگی جو ہمارے ہم خیال نہیں۔ ڈاکٹر کچلو (سابق وزیر یو پی) اس دعوے کی دلیل میں کہ جمہوریت عین اسلام کے مطابق ہے فرماتے ہیں :-

> مُسلمانوں کا نماز کے لیئے حیرت انگیز اجتماع مسلمانوں کی زندگی جمہوریت کا بہترین مظہر ہے۔
>
> جمہوریت اور اسلام لازم و ملزوم ہیں۔ لیکن اس کے باوجود مسلمان جمہوریت کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔" (اسٹیٹس مین ۲۴ جنوری)

دیکھیئے۔ جادو کس طرح سرچڑھ کر بولتا ہے۔ بالکل درست فرمایا۔ یہی ہے وہ نظام جو مسلمانوں کے

نزدیک قابل قبول ہے۔ یعنی خالص اپنی جماعت - اپنا امام اور اس امام کی اطاعت - ہم ڈاکٹر کچلو سے پوچھتے ہیں کہ کیا انہوں نے کبھی ایسا بھی دیکھا ہے کہ نماز کی جماعت میں اکثریت غیر مسلموں کی ہو اور یہ اکثریت ایک ہندو کو امام منتخب کرے اور پھر مسلمان اس امام کے پیچھے نماز ادا کر رہے ہوں! بس یہی ہے فرق اسلامی جمہوریت اور کانگرسی جمہوریت میں - اسلامی جمہوریت نماز کی اس شکل پر مرتب ہوگی جو چودہ سو سال سے چلی آرہی ہے۔ اور کانگرسی جمہوریت وہ دوسری شکل ہے جسے آج مسلمانوں کے سامنے اسلامی لیبل لگا کر پیش کیا جا رہا ہے، حالانکہ وہ خالصتہً غیر اسلامی ہے مسلمانوں کی جماعت خالص اسلامی جماعت ہوگی۔ متحدہ قومیت کی جمہوری جماعت نہیں ہوگی۔ اب آپ خود ہی فیصلہ فرمائیے کہ مسٹر جناح ہمیں کس قسم کی نماز کی طرف دعوت دے رہے ہیں اور جناب نوری اینڈ کو کدھر بلا رہے ہیں۔ ان لوگوں سے ہم سوائے اسکے اور کیا کہیں کہ مسٹر جناح نے جو کچھ کہا تھا وہ تو بالکل واضح تھا۔ لیکن

تیرے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیئے!

ضرورت ہے

طلوع اسلام کے لیئے ایک مدیر معاون کی۔ وہ حضرات جو اس مسلک سے متفق ہوں۔ اور اس معیار کے مطابق لکھ سکتے ہوں۔ بہت جلد اپنی درخواستیں ارسال فرمائیں انگریزی اور عربی کی اچھی استعداد ضروری ہے۔ بہتر ہو کہ شرائط معاونت کے ساتھ اپنے کسی مطبوعہ مضمون کی ایک نقل بھی بھیجدی جائے۔ دفتر کے روزمرہ حساب کتاب کا تجربہ بھی ہو تو اچھا ہے

لیکن جلدی کیجیے۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام بلیماران دہلی

حقائق و عبر

ہندوستان میں ہندوؤں کے منصوبے کیا ہیں؟ یہ چیز اب قیاس و گمان کی حد سے گزر کر یقین و بصیرت کے نقطہ تک آپہنچی ہے وہ یہاں انگریزوں کی سنگینوں کے سایہ میں خالص مہاسبھائی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اُنھوں نے اِس راز کو بھی سمجھ لیا ہے کہ بھارت ورش میں رام راجیہ کے قیام و بقا کے لیے سب سے مقدم یہی امر ہے کہ مسلمان کو من حیث القوم زندہ نہ رہنے دیا جائے۔ مسلمانوں کی جداگانہ ہستی کا راز اُنکے مذہب میں پنہاں ہے اِس لیے ہندو شاطرانِ بساطِ سیاست نے اپنی پوری توجہات اِسی نقطہ پر مرکوز کر دی ہیں کہ کسی نہ کسی طرح مسلمان کو اِس امتیازی نشان سے محروم کر دیا جائے۔ اسکے بعد اِس کے ملّی تشخص کا انہلاک کچھ مشکل نہ ہوگا۔ چنانچہ اِسکے لیے ایک منظم سکیم تیار کی گئی۔ اور اُس کی باگ ڈور گاندھی جی جیسے پرکار شکاری کے ہاتھ میں دیدی گئی ایک دیدہ ور شکاری کو خوب معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ خود جال کے قریب آکر کھڑا ہو جائے تو وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ بہترین طریقہ یہ ہوتا ہے کہ جس قسم کے پرندوں کو پھنسانا مقصود ہو۔ انہی میں سے دو چار پرندے سدھائے جائیں۔ اور اُن کی آنکھیں سی کر جال کے قریب چھوڑ دیا جائے۔ ان کی دلکش آواز پر کسی کو گمان تک نہیں ہو سکتا، کہ یہ دامِ تزویر میں گرفتاری کی دعوت ہے۔ اِسلیئے اُنکے ہم جنس پرندے اُنکے گرد جوق در جوق جمع ہو جاتے ہیں اُن کو حلقۂ دام کا اُسوقت احساس ہوتا ہے جب پھندا گلوگیر ہو چکتا ہے۔ مسلمانوں کو اُنکے مذہبی تفوق کے جذبہ سے بیگانہ اور ملّی تشخص کے احساس سے ناآشنا کرنے کے لیے یہی پرفن حربہ استعمال کیا گیا۔ اور اُس کی پہلی کڑی مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر ترجمان القرآن کی شکل میں منصۂ شہود پر آئی۔ اِس تفسیر میں الفاظ قرآنی کے حسین و جمیل پردوں کی آڑ میں غیر محسوس طریقے پر اِس خیال کو قلوب اور اذہان میں راسخ کرنے کی کوشش کی گئی کہ

عالمگیر سچائیوں کے اعتبار سے تمام مذاہب یکساں ہیں۔ فرق صرف ظواہر و رسوم میں ہے جنکی کچھ اہمیت نہیں۔ اسلیئے یہ خیال باطل ہے کہ ایک مذہب دوسرے مذہب پر کوئی فوقیت رکھتا ہے۔ الہلال والبلاغ کے مدیر اعلیٰ مولانا آزاد کا نام۔ اور قرآن کریم کی تفسیر۔ کس کی مجال تھی کہ کسی بدگمانی کو دل میں جگہ دے کر اس صحیفۂ مقدسہ کو چھوئے۔ وار چل گیا۔ تیر ٹھکانے پر لگ گیا۔ اور آہستہ آہستہ غیر شعوری طور پر مسلمانوں کے نوجوان طبقہ کے رگ و پے میں یہ زہر سرایت کر گیا۔ کہ فی الواقعہ یہ خیال کہ اسلام ہی سچا دین ہے" مذہبی تعصب" اور" تنگ نظری" ہے۔ کسی مذہب کو دوسرے مذہب پر کوئی تفوق حاصل نہیں۔ چنانچہ اسکے بعد اکبر کے دینِ الٰہی کی تجدید کی تجاویز سامنے آنے لگیں۔ برہمو سماج کو عام کرنے کے چرچے ہونے لگے۔ بنارس کے ایک ودوان نے مختلف مذاہب کی آسمانی کتابوں کو ملا کر ایک" نئی آسمانی کتاب" تصنیف کرنے کی سکیم پیش کر دی۔ جب گاندھی جی نے دیکھا کہ یوں زمین تیار ہو گئی ہے۔ تو ایک دن نہایت سادگی سے فرمایا کہ جب مولانا آزاد جیسے متبحر عالم کی بصیرتِ قرآنی برملا کہتی ہے کہ تمام مذاہب یکساں ہیں تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ مسلمان تبلیغ کی تحریک کے پیچھے کیوں پڑتے ہیں، مجھے تو یہ ایک خالص سیاسی چال نظر آتی ہے، رفتہ رفتہ اس خیال کو عام کیا گیا۔ اور نوبت بانیجا رسید کہ اب مختلف گوشوں سے اس قسم کی آوازیں بھی آنی شروع ہو گئیں کہ

"ہندوستان میں مسئلہ اقلیت کا مؤثر حل یہ ہے کہ تبدیلیٔ مذہب قانوناً روک دی جائے تاکہ اقلیتوں کی آبادی کا تناسب جامد ہو جائے۔" (ڈاکٹر مونجے ہندوستان ٹائمز ۱۴-۳-۳۹)

ایک طرف یہ خیال عام کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف جناب شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے مقدس ہاتھوں سے وار دھا کی تعلیمی اسکیم کا سنگِ بنیاد رکھا دیا گیا ہے۔ جس میں مذہبی تعلیم کا مرکزی تصور وہی ہے جسکا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ موجودہ نسل کے بعد جب مسلمانوں کی دوسری پشت کی ذہنی تشکیل اس جدید تعلیم کے مطابق ہو گی۔ اسوقت ڈاکٹر مونجے کے اس" خیال" کو" قانون" بنا دینے میں کیا دقت ہو گی۔ اور اگر اُسے قانونی حیثیت نہ بھی دی گئی تو بھی مذہبی نقطۂ نگاہ سے ایک مسلمان اور ہندو میں کوئی فرق نہ ہو گا، اسلیئے کہ یہ عقیدہ مسلمان کا جزوِ ایمان ہو چکا ہو گا

کہ تمام مذاہب یکساں ہیں۔ اسلام کو کسی دوسرے مذہب پر کوئی فوقیت حاصل نہیں

اس شکاری کے دامِ تزویر کی دوسری کڑی یہ تھی کہ مذہب۔ انسان اور خدا کے درمیان ایک ذاتی معاملہ کا نام ہے۔ سیاسیات میں اسے کوئی دخل نہیں ہونا چاہیئے۔ اس نظریہ کی ترویج میں گاندھی جی کو کچھ زیادہ دقّت نہیں ہوئی۔ اسلئے کہ مسلمان صدیوں سے اس نظریہ پر عملاً کاربند چلے آرہے ہیں۔ لیکن اس باب میں ایک چیز بڑی تحیّر انگیز ہے، قومیت پرست علماء کا طبقہ خود تو میدانِ سیاست میں شریک ہوگیا۔ لیکن کانگرس کے اس اعلان کو ہمیشہ خاموشی سے سُنتا چلا آرہا ہے کہ مذہب کو سیاست سے کچھ واسطہ نہیں۔ اس سے آپ اندازہ فرمالیجئے کہ نیشنلسٹ ہوجانے کے بعد مسلمانوں کو کس طرح اپنے حقیقی خیالات کے اظہار سے مجبوراً رکنا پڑتا ہے جو حضرات طلوعِ اسلام کا مسلسل مطالعہ کرتے چلے آئے ہیں۔ اُنہیں معلوم ہے کہ کانگرس کے بڑے بڑے ذمہ دار حضرات نے مسلمانوں کے اس عقیدے کا کس قدر تمسخر اُڑایا ہے کہ اُنکے ہاں مذہب سیاست سے جُدا نہیں ہے بایں ہمہ ہمارے نیشنلسٹ علماء حضرات میں سے کسی ایک نے آج تک احتجاج کا ایک لفظ اپنے مُنہ سے نہیں نکالا۔ یہی نہیں بلکہ ہمارے قومیت پرست حضرات ہندو زعمائے کانگرس کو اپنے گھر میں بلا بُلا کر یہہ باتیں اُن سے سنتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں ابھی دس روز کی بات ہے کہ عیدالفطر کی تقریب پر بمبئی کی مجلس احرار نے بھولا بھائی ڈیسائی کو دعوتِ "وعظ" دی۔ جس میں انہوں نے نہایت بلند آہنگی سے فرمایا کہ

"چونکہ مذہب خدا اور بندے کے درمیان ایک پرائیویٹ معاملہ ہے اسلئے اسے سیاست سے ملانا نہیں چاہیئے"۔ (ہندوستان ٹائمز۔ $\frac{11}{39}$ ۱۴)

اور مجمع نے خوب دادِ تحسین دی۔ اگلے دنوں ایک کانگرسی اخبار ہندوستان ٹائمز اپنے مقالہ افتتاحیہ میں لکھتا ہے کہ:۔

"جمہوریت کا سیاسی نظام مذہبی جماعت بندی کو تسلیم نہیں کرتا۔ اور وہ اس امر سے یکسر انکار کرتا ہے کہ کوئی مذہبی (روحانی) عقیدہ کسی سیاسی معاملہ کی بنا قرار دیا جاسکتا ہے"

(مورخہ $\frac{1}{39}$ ۳)

اسی پر اکتفا نہیں۔ ذرا اور آگے بڑھیے۔ اور۔

درازدستی ابن کوتہ آستیناں بیں!

قرآن کریم کی رو سے مسلمان کی زندگی کا نصب العین اس دنیا میں حکومتِ خداوندی کا قیام ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے کہ جس سے کسی ایسے شخص کو مجالِ انکار نہیں ہوسکتی جسکا قرآن کریم پر ایمان ہے۔ لیکن سُنیے کہ کانگرس کا یہی ترجمان اپنے ایک اور مقالہ افتتاحیہ میں کس جرأت سے لکھتا ہے کہ:۔

"حکومتِ الٰہی کا تصور ایک داستانِ پارینہ ہے اور یہ مسلمانوں کا ایک فعلِ عبث ہوگا اگر وہ ہندوستان جیسے ملک میں اسکے احیاء کی کوشش کریں۔ جہاں مختلف جماعتیں ایک دوسرے میں گتھی ہوئی ہیں۔ یا اس امر کا خیال کریں کہ اس مقصد کے لیے مُلک کو دو حصوں میں تقسیم کردیا جائے۔ یہ علامت بڑی خوش آئند ہے کہ مسلمانوں کے ذمہ دار رہنما اس سراب کے پیچھے لگنا نہیں چاہتے"

(ہندوستان ٹائمز ۱۴)

ہم اس ہمہ خود غلط کانگرسی آرگن اور اس کی وساطت سے کانگرس کے تمام اربابِ حل وعقد کو برملا بتا دینا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کی زندگی کا مقصدِ وحید حکومتِ الٰہیہ کا قیام ہے۔ پہلے اپنے گرد وپیش اور اسکے بعد ساری دنیا میں۔ اور اگر وہ چند قومیت پرست مسلمان جنہیں یہ اخبار بزعم خویش "مسلمانوں کے ذمہ دار رہنما" قرار دے رہا ہے۔ اپنی مصلحت کوشیوں اور ایمان فروشیوں کی بناء پر اس حقیقت کے اعلان سے گھبراتے ہیں تو اُنکے آقایانِ نعمت کو خوش ہونا چاہیے کہ:۔

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ○

یہ لوگ اللہ کو اور جماعتِ مومنین کو دھوکا دینا چاہتے ہیں حالانکہ (اس طرح) یہ خود اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں لیکن سمجھتے نہیں۔

بہر حال یہ گاندھی جی کے جال کی دوسری کڑی تھی اور اس میں ہمارے قومیت پرست بہی خواہانِ ملت کے تصدق۔ انہیں کچھ نہ کچھ کامیابی ضرور ہوئی ہے۔

اب اِس دامِ فریب کی تیسری اور سب سے اہم کڑی لیجیے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ کڑیاں الگ الگ نہیں ہیں۔ بلکہ ایک دوسری خود بخود پیدا ہوتی جاتی ہے تیسری کڑی یہ تھی کہ ہندوستان کی چار دیواری میں بسنے والے تمام لوگ بلا تمیز مذہب ایک قومیت کے افراد ہیں۔ اسکے لیے کچھ عرصہ ہوا دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا حسین احمد صاحب مدنی نے فتویٰ صادر فرمایا کہ "قومیتیں اوطان سے بنتی ہیں۔ مذہب سے نہیں بنتیں" اور جب اس کی مخالفت ہوئی تو اس کی تائید میں کتاب و سنت کو مسخ کرنا شروع کر دیا۔ مختصر یہ کہ ہندوستان کی فضا میں اِس خیال کو بھی عام کیا گیا کہ مسلمان مذہبی امتیاز و تفوق کی بنا پر ایک جُداگانہ قوم بننے کا دعوےٰ نہیں کر سکتے۔ قوم کے لیے تو ہم وطن ہونا ہی شرط ہے۔ نہ کہ ہم مذہب ہونا۔ چنانچہ جب اِس خیال کا چرچا ہو گیا۔ تو پچھلے دنوں گاندھی جی پھر کٹیا سے باہر تشریف لائے اور ہری جن بابت $\frac{11}{39}$ ۱۴ کے مقالہ افتتاحیہ میں مسلمانوں کے اِس دعوے کی نہایت واضح الفاظ میں تردید کی کہ ان کی قومیت کا مدار مذہب ہے نہ کہ اتحادِ رنگ و نسل و وطن، ان کے بعد اُنکے متبعین نے شرح وبسط سے مسلمانوں کے اِس دعوے کی تغلیط کی اور اُسکا مضحکہ اُڑایا۔

چنانچہ ہندوستان ٹائمز اپنی $\frac{11}{39}$ ۱۴ کی اشاعت کے مقالۂ افتتاحیہ میں لکھتا ہے؟

"ہندوستان میں ایک متحدہ قومیت کا تصور کانگرس کے اوّلین بانیان کے دماغ کا رہین منّت ہے کیونکہ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ اگر اس مُلک کی مختلف جماعتوں اور فرقوں کو ایک قوم میں تبدیل کرنا ہے تو یہ صرف متحدّہ قومیت کے نظریے کے ذریعہ ہی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ جہاں نسل، زبان، اور مذہب باہمی تفریق کا باعث بنتے ہیں۔ سیاست معاشی مفاد اور متحدّہ قومیت کا احساس اُن میں باہمی امتزاج پیدا کرتا ہے"۔

حتےٰ کہ مسٹر ڈیسائی نے مذکورہ صدر تقریبِ عید کی تقریر میں تو یہاں تک فرما دیا کہ مسلمان جو مذہبی تحفظات چاہتے ہیں۔ انہیں دے دینے چاہئیں۔

"لیکن اس کے بعد ان کی جُداگانہ ہستی کا کوئی تذکرہ نہیں ہونا چاہیے" (ہندوستان ٹائمز $\frac{11}{39}$ ۱۴)

سطورِ بالا میں جو کچھ پیش کیا گیا ہے اُسے ایک مرتبہ پھر انِ الفاظ میں دُہرا لیجیے کہ:۔

(۱) تمام مذاہب اصولی طور پر یکساں ہیں۔ اسلام کو کسی دوسرے مذہب پر کوئی فوقیت نہیں۔ اسلیے تبلیغ ایک سیاسی حربہ ہے، جسے قانوناً روک دینا چاہیے۔

(۲) مذہب ایک نجی کا معاملہ ہے، جسے سیاسیات سے کوئی واسطہ نہیں۔

(۳) مذہب کے ظواہر و رسوم (مثلاً نماز۔ روزہ) کے متعلق مسلمانوں کو تحفظات کی ضمانت دیدینی چاہیے اور اسکے بعد انہیں اپنے جداگانہ ملّی وجود کے تذکرہ سے بند کر دینا چاہیے کہ یہ چیزیں متحدہ قومیت کے راستہ میں روڑا اٹکاتی ہیں +

یہ ہے ماحصل موجودہ "جہادِ آزادی" کا۔

ہم تنگ نظر ہیں۔ آزادی کے دشمن ہیں۔ غلامی کے حامی ہیں، لیکن ہم پوچھتے ہیں اپنے حریت پسند آزادی کے پرستار، اسلام کے سب سے بڑے مجاہدین کی جماعت قومیت پرست سے کہ جو کچھ وہ ہندوؤں کے ساتھ ملکر کر رہے ہیں۔ کیا وہ کسی صورت میں بھی اسلام کی دوستی کہلا سکتی ہے؟ یہاں آپ اپنے مخالفین کو ٹوڈی اور غلامی کے حامی کہہ کر اپنے آپ کو خوش کر سکتے ہیں لیکن ذرا سوچو تو سہی کہ ایک دن خدا کے سامنے جانا ہے۔ کیا وہاں کے لیے بھی کوئی جواب آپنے سوچ رکھا ہے؟ وہاں تو ان طعنوں سے کام نہیں چلے گا۔

قریب ہے یار روزِ محشر۔ چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر
جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا!

اچھوت نمبر ۲

گاندھی جی لکھتے ہیں:۔

"کانگریس کے حامی مسلمان تو (مسلمانوں کے نزدیک) اچھوت خیال کیے جاتے ہیں"۔ (ہریجن ۱۱/۳/۳۹)

لو وہ بھی کہہ رہے ہیں کہ بے ننگ و نام ہے — یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں

ایسا کیوں ہے؟ اسکا جواب بھی گاندھی جی نے خود ہی دیدیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"کانگرسی لوگوں کے نزدیک قومیت پرستی (Nationalism) اُنکے مذہب کا جزو ہے

عام اِسکے کہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان۔ عیسائی ہوں یا کوئی اور" (ایضاً)

بات ٹھیک ہے۔ مسلمانوں کی برادری میں تو وہی رہ سکتاہے۔ جسکا مذہب وہ ہو جو رسولِ کافۃ للناس صلعم کی رسالت سے انھیں ملا۔ اور جس میں رنگ۔ نسل۔ وطن کی بنا پر قومیت کی تشکیل حرام ہے لہٰذا ہر وہ شخص جو ہندی قومیت کو جزوِ مذہب بناتا ہو کس طرح مسلمانوں کی برادری میں شامل رہ سکتا ہے

لیگ کا مطمحِ نگاہ

ہمارے نیشنلسٹ مسلمان ہمیشہ یہ کہہ اپنے آپ کو خوش کر لیتے ہیں کہ لیگ کا تو نصب العین ہی غلامی پر رضامندی ہے۔ اسکے ساتھ ہم کیوں شامل ہوں۔ لیکن سُنیئے کہ زعمائے کانگرس اِس باب میں کیا کہتے ہیں۔ مسٹر جناح سے مُلاقات کے بعد الہ آباد کی ایک تقریر میں پنڈت جواہرلال نہرو فرماتے ہیں

"ہماری باتیں بالکل کھلی کھلی ہوئیں۔ اور اگرچہ زاویۂ نگاہ میں فرق ہے۔ لیکن جہاں تک مطمحِ نظر کا تعلق ہے۔ لیگ اور کانگریس میں کوئی اختلاف نہیں۔ دونوں کا نصب العین آزادی ہے"

(اسٹیٹسمین ۶/۱۱/۳۹)

ہندوستان ٹائمز اپنی ۳ر نومبر کی اشاعت کے مقالۂ افتتاحیہ میں رقمطراز ہے۔

"لیگ کا نصب العین۔ کانگرس کی طرح آزادی ہے"

ہم اپنے نیشنلسٹ مسلمان بھائیوں سے پوچھتے ہیں کہ جب ایک خالص اسلامی جماعت کا نصب العین بھی وہی ہے جو کانگریس کا ہے تو اُنہیں ہندوؤں کی بجائے مسلمانوں کے ساتھ اشتراکِ عمل سے کیا چیز مانع ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ لیگ کے ذرائع آمدنی اتنے وسیع نہیں۔ لیکن اسلام کی کشش بھی تو کوئی چیز ہے۔

افلاس و تدبر | وائسرائے صاحب نے کانگرسی لیڈروں کو دعوت دی۔ گاندھی جی اور صدر کانگرس

بابو راجندر پرشاد جانی پر تیار ہوئے۔ مجلس شوریٰ بلائی گئی۔ معاملات زیر نظر کافی غور و خوض ہوا۔ بڑی بڑی تیاریوں کے بعد ملک کی کشتی کے یہ ناخدا و السرائے کے حضور میں پہنچے۔ لیکن وہ جو غالب نے کہا ہے کہ

کرنے گئے تھے ان سے تغافل کا ہم گلہ!
کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

حضور و السرائے کی ایک ہی نگاہ جبروت سے سب کچھ بھول گئے۔ اور جیسے گئے تھے ویسے ہی لوٹ آئے۔ گھر آکر کچھ سکون ہوا۔ رفقائے کار نے پوچھا کہ وہ جو دنیا دی مسئلہ تھا کہ "حکومت برطانیہ کے جنگ کے مقاصد کیا ہیں"؟ اسکا کیا جواب ملا۔ تو دونوں نمائندے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ بالآخر والسرائے صاحب کو چٹھی لکھی گئی کہ سرکار! وہ جو پتے کی بات تھی اسکا تو وہاں ذکر ہی نہیں آیا۔ یہ ہیں ہمارے لیڈر! ایک صدر جمہوریت مملکت ہندیہ اور دوسرے وہ جنہیں تری پوری کانگرس میں "منزہ عن الخطا" ہونے کا تمغہ ملا تھا۔ ان سے پوچھیے کہ اگر اس اصولی بات کا ذکر والسرائے صاحب نے نہیں چھیڑا تو آپ وہاں کیا کرنے گئے تھے۔ آپنے خود اس بات کو کیوں نہ چھیڑ دیا؟

(۵) پھر بولے!

شیخ سعدیؒ نے ایک مستبد بادشاہ کے متعلق لکھا تھا کہ:۔

ظالمے را خفتہ دیدم نیم روز — گفتم ایں فتنہ است خوابش بردہ بہ
واں کہ خوابش بہتر از بیداریست! — آنچناں بد زندگانی مردہ بہ

یعنی جس کا سونا اسکے جاگنے سے بہتر ہے اس کی موت اس کی زندگی سے اچھی ہے۔ اسی طرح اس دنیا میں بعض لوگ ایسے بھی ہیں کہ جن کی خاموشی انکے بولنے سے اچھی ہوتی ہے۔ انہی میں سے ایک صاحب حکومت پنجاب کے وزیر تعلیم ہیں۔ جنکا تذکرہ گزشتہ اپریل کے طلوع اسلام کے صفحات میں آچکا ہے اسکے بعد وہ پھر بولے ہیں۔ ۲۰ نومبر کے پنجاب اسمبلی کے اجلاس میں اردو کی حمایت میں تقریر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

ہندوستان کو ایک قوم بنانے کے لیئے یہ ضروری ہے کہ تعلیم ایک زبان کے ذریعہ دی جائے۔" (اسٹیٹسمین ۲ ۱۱/۳۹)

یعنی یہ بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کے امتزاج سے متحدہ قومیت کی تشکیل چاہتے ہیں

دُرست ہے۔

وزیرے چنیں شہریارے چناں !

جس حکومت کے وزیرِاعظم جناب سرسکندر حیات خاں جیسے ہوں، اسکے اعیان و ارکان کی یہی حالت ہونی چاہیئے۔ جناب وزیرِاعظم صاحب نے بھی تو گزشتہ مارچ میں حزبِ مخالف کو فرقہ وارانہ جذبات کو دُور کرکے یک جہتی کی فضا پیدا کرنے کی نصیحت کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ۔

"اگر اس قسم کی فضا پیدا ہوگئی تو پھر مسلم لیگ اور ہندو مہا سبھا جیسی فرقہ وارانہ جماعتیں خود بخود معدوم ہو جائیں گی" (ہندوستان ٹائمز ۱۷ ۳/۳۹)

دہلی سے ایک اسلامی ماہنامہ شائع ہوتا ہے جسکے اغراض و مقاصد کی اولیں شق ہے۔

"وقت کی جدید ضرورتوں کے مطابق قرآن و سُنت کی مکمل شرح و تفسیر مروجہ زبانوں میں خصوصیت سے اُردو، انگریزی زبان میں کرنا"

اس پرچہ کی نومبر کی اشاعت میں ایک نظم بعنوان "نفیرِ وطن" شائع ہوئی ہے۔ جسکا ایک شعر ملاحظہ فرمایئے ارشاد ہے :۔

کوثر و سلسبیل کے گیت بہت مدھر سہی
شام و سحر یہ نغمۂ گنگ و جمن کچھ اور ہے

یہ ہے "قرآن و سُنت کی مکمل شرح و تفسیر" کا نمونہ !

حقیقتِ حج

از علامہ حافظ محمد اسلم صاحب جیراج پوری

دین اسلام کا ہر ہر رکن ایک ایک خاص خاص غرض کے لیے ہے۔ ان میں سے ملت کی اجتماعی اصلاح حج سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ رکن اگر صحیح طور پر ادا ہونے لگے تو بلا کسی کوشش اور بغیر کسی چندہ کے اس انتشار و تشتت کو جس نے ملت کو پارہ پارہ اور امت کو پرزے پرزے کر رکھا ہے دور کر کے اجتماعی زندگی پیدا کر سکتا ہے۔

اس مضمون میں میں نے کوشش کی ہے کہ حج کی حقیقت اور اس کی تاریخ کے ساتھ ساتھ اس کے فوائد اور اس کو صحیح طور پر ادا کرنے کی صورت بھی بیان کروں۔

اسلم

فریضۂ حج اسلام کے ارکان خمسہ میں سے حج وہ رکن ہے جو اسلام کی حقیقی بنیاد یعنے توحید کا سب سے بڑا مظہر ہے۔ جیسی موحدانہ عبودیت مخلصانہ خشیت الٰہی اور والہانہ شیفتگی اس میں پیدا ہوتی ہے اور کسی دوسری عبادت میں نہیں پیدا ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مرکز توحید کو جہاں حج کے مناسک ادا کیے جاتے ہیں اللہ نے کچھ ایسی خصوصیت بخشی ہے کہ وہاں مومن کے قلب پر وہ کیفیت طاری ہو جاتی ہے جس کا گمان اور اندازہ بھی دوسری جگہ نہیں کیا جا سکتا۔

حج ۶ھ میں فرض کیا گیا۔ ہر مسلمان پر جو سفر کی طاقت اور اس قدر مال رکھتا ہو کہ اس کے مکہ آنے جانے اور واپسی تک اس کے اہل و عیال کے خرچ کے لیے کافی ہو زندگی بھر میں ایک بار حج کرنا لازم ہے اور باوجود استطاعت کے حج نہ کرنا گناہ بلکہ کفر ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے:-

"اور لوگوں پر بیت اللہ کا حج خالص اللہ کے لیے فرض ہے (یعنی) ان پر جو وہاں تک جانے کی استطاعت رکھتے ہوں اور جو کوئی کافر بن جائے تو اللہ دنیا جہان سے بے نیاز ہے۔"

تاریخ حج عہد الست کا حامل انسان ابتدائی زمانہ میں باوجود نبیوں اور رسولوں کی تعلیموں کے توحید کی طرف

کم مائل ہوا اور اپنی نادانی سے زیادہ تر مظاہر پرستی میں مبتلا ہو کر شرک کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو برگزیدہ فرمایا جو اپنی مستحکم توحید اور شان حنیفیت کے باعث موحدوں کے پیشوائے اعظم ہو گئے۔ اُنہوں نے اکیلے اللہ کی خاطر اپنے باپ۔ گھر، خاندان اور وطن سب کو چھوڑنا گوارا کیا اور جس وقت حجاز کے اس بے آب و گیاہ خطہ میں اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیل کو لے کر آئے اس وقت دونوں نے مل کر خلوص قلب اور دلی دعاؤں کے ساتھ اکیلے اللہ کی عبادت کے لیے کعبہ کو تعمیر کیا جو دنیا میں موحدوں کی سب سے پہلی مسجد ہے۔ اللہ نے ان کی دعائیں قبول فرمائیں اور اس گھر کو مبارک اور سرچشمۂ ہدایت بنایا۔ جیسا کہ قرآن میں ہے۔

"پہلا (توحید کا) گھر جو بنی نوع انسان کے لیے بنایا گیا ہے وہ جو مکہ میں ہے برکت والا ہے اور دنیا بھر کے لیے ہدایت ہے۔"

تیار ہو جانے کے بعد حضرت ابراہیمؑ کو حکم دیا کہ لوگوں میں اعلان کر دو کہ حج کے لیے یہاں آیا کریں۔

"اور بنی نوع انسان میں حج کا اعلان کر دے وہ تیرے پاس پاپیادہ اور سواریوں پر جو ہر دور و دراز کے رستوں سے آتی ہیں آئیں گے۔"

اس اعلان کے بعد سے حج شروع ہوا۔ اور سلسلے وار ہوتا چلا آیا۔ لیکن قرنوں پر قرن اور صدیوں پر صدیاں گزر جانے کی وجہ سے اس میں تغیرات واقع ہو گئے اور خرابیاں پڑ گئیں۔ کیوں کہ اولاد ابراہیم میں سے بنی اسرائیل جن میں انبیاؑ پیدا ہوتے تھے اور آسمانی کتابیں اترتی تھیں۔ ان کا قبلہ بیت المقدس قرار پا گیا اور کعبے کا حج بنی اسمٰعیل کی قیادت میں ہوتا رہا۔ جو علوم شریعت سے بے بہرہ اور توحید کی حقیقت سے ناآشنا ہو گئے تھے۔ اُنہوں نے اس موحدانہ عبادت کو مشرکانہ رسوم کا مجموعہ بنا لیا تھا اور اس توحید کے گھر میں سینکڑوں بتوں کو نصب کر دیا تھا جن کی پوجا ہوتی تھی۔

حج اکبر جب بنی اسمٰعیل میں دعائے ابراہیمی کا ظہور ہوا اور نبوت کبریٰ کے وارث رسول عربی محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو اُنہوں نے بحکم الٰہی پھر اس توحید کے رکن یعنے حج کو شرکیات سے پاک کر کے اپنی اصلی شکل میں قائم کیا۔ ۹ھ پہلا سال ہے جس میں عہد ابراہیمی و اسمٰعیلی کے بعد دوبارہ صحیح اُصول پر یہ فریضہ ادا کیا گیا۔ یہ حج تاریخ اسلام میں حج اکبر کے نام سے مشہور ہے۔ کیوں کہ قرآن کریم میں اس کا یہی نام

رکھا گیا ہے اس حج کے امیر سیدنا صدیق اکبرؓ اور نقیب سیدنا علی مرتضےٰ رضی اللہ عنہم۔

موسم حج یہ رکن چوں کہ بنیاد اسلام یعنے توحید نیز ملت کے ہر طرح کے منافع کا کفیل ہے۔ اس لیے سال کا ایک چوتھائی حصّہ یعنے شوال، ذی قعدہ اور ذی الحجہ تین مہینے اس کے لیے مخصوص کیے گئے حج کی نیت کرنیوالے خالص توحید اور اکیلے اللہ کی رضامندی کی طلب کے لیے جائیں۔ نہ لڑیں نہ جھگڑیں نہ عورتوں سے ملاعبت کریں اور زادراہ ساتھ رکھیں۔ تجارتی سامان بھی فروخت کے لیے لے جانا ممنوع نہیں ہے۔ ۹ ذی الحجہ کو میدان عرفات میں حج ہوتا ہے۔

فوائد حج حج میں اللہ نے دین اور دنیا دونوں کے بہت فائدے رکھے ہیں۔

(۱) اس توحید کے مرکز میں فریضۂ حج ادا کرنے سے مسلمان عہد ابراہیمی کو تازہ کرکے حنفاء کی جماعت میں داخل ہوکر اپنے رب کی خوشنودی حاصل کرتا ہے جو سب سے بڑی نعمت ہے۔

(۲) کعبہ میں جہاں دنیا کے ہر خطّہ کے موحّدوں کے گروہ آکر جمع ہوئے ہیں مسلمان آنکھوں سے دیکھتا ہے کہ اسکا دین کسی خاص قوم یا ملک کا مذہب نہیں ہے۔ بلکہ وہ دین الٰہی ہے جو تمام عالم انسانیت میں اخوت قائم کرنے کیلئے ہے

(۳) حج میں بعبے کا طواف اور وہاں کی عبادت نصیب ہوتی ہے جو دنیا کی سب سے پہلی مسجد ہے اور ام المساجد کہی جاتی ہے۔ اور جو مبارک ہے اور ہدایت کا سرچشمہ۔

(۴) حج میں مساوات اور اخوت ہے اور وہاں آقا اور غلام اور شاہ و گدا کا امتیاز اٹھ جاتا ہے اور سب ایک ہی قسم کے فقیرانہ لباس میں ننگے سر حقیقی معبود کے آستانہ پر حاضر ہوتے ہیں۔

(۵) حج میں دنیا کے ہر ملک کے مسلمان آکر جمع ہوتے ہیں جو آپس میں ایک دوسرے سے ہر قسم کے دینی دنیاوی علمی اور عقلی فائدے حاصل کرسکتے ہیں۔

(۶) حج جیسی مقدّس انجمن سوائے مسلمانوں کے اور کسی قوم یا ملت کے پاس نہیں ہے اس کے ذریعے سے ساری دنیا کے مسلمان ایک ہوسکتے ہیں۔ اور سب کا متحدہ لائحہ عمل یہاں سے تیار ہوسکتا ہے۔

(۷) حج میں سیر و سیاحت کے علاوہ دوسرے ملکوں کے لوگوں سے مل کر طرح طرح کے تجربے حاصل ہوتے ہیں۔

(۸) حج ایک مجاہدانہ روح اور فوجی نظام پیدا کرتا ہے۔ کیوں کہ تمام حجاج ایک لباس پہنتے ہیں۔ اور ناشائستہ

کلام، باہمی لڑائی جھگڑا۔ فحش اور بے حیائی کی باتیں سب ان کے لیے ممنوع ہیں۔ وہ ایک ساتھ مل کر طواف کرتے ہیں اور ایک ساتھ میدان عرفات میں جاکر حاضری دیتے ہیں۔

(۹) حج میں آدمی چاہے تو سامانِ تجارت لے جاکر بہت نفع کما سکتا ہے۔ کیوں کہ حج میں تجارت اور خرید و فروخت کی بھی اجازت ہے۔ قرآن میں حج کے بیان میں ہے۔ "تمہارے لیے کوئی حرج نہیں ہے کہ (حج میں) تم اپنے رب کا فضل (سامان معیشت) کماؤ"

الغرض اس رکن میں شخصی اور قومی اور ملکی و ملّی ہر طرح کے بے شمار فوائد ہیں۔ اللہ نے قرآن میں ایک مختصر فقرے میں ان سب کو ادا کر دیا ہے۔ "تاکہ لوگ اپنے فائدوں کے لیے حاضر ہوں" لیشھدوا منافع لھم۔

یہ فائدے نہ دنیا کے ساتھ مخصوص ہیں نہ دین کے ساتھ۔ بلکہ ہر طرح کے علمی، عقلی، مالی اور سیاسی فوائد اس میں داخل ہیں۔

احرام کعبہ ابھی سینکڑوں میل ہے لیکن حجاج معینہ میقاتوں سے نہا دھو کر اور دو رکعت نماز پڑھ کر اس مقدس مسجد کا زائرانہ لباس پہن لیتے ہیں جس کو جامۂ احرام کہتے ہیں۔ ایک لنگی اوپر ایک لنگی نیچے۔ زیب و زینت کچھ نہیں۔ خوشبو اور آرائش ممنوع۔ آقا اور غلام برابر ہو گئے، شاہ و گدا کا امتیاز اُٹھ گیا۔ اخوت ہی اور مساوات سب کے سب ایک رب العزت کے آستانہ کے فقیر اسی کی توحید کا دم بھرنے والے۔ اللّٰھمّ لبیک۔ لاشریک لک لبیک۔ ہر ایک کے وردِ زبان۔ سارے جھگڑے ٹنٹے ختم، شکار اور کھیل حرام اور لہو و لعب بند۔ قافلہ رواں اور دواں ہے۔ وفورِ شوق سے دل بے تاب ہو رہے ہیں کہ کب اس منزل پر پہنچیں جہاں برکتیں اُترتی اور رحمتیں برستی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ جگہ آگئی۔ لبیک کے نعروں سے فضا گونج اُٹھی۔ زائرین بے قرارانہ شہر میں داخل ہوئے اور پاک و صاف ہو کر اس گھر میں پہنچے جو دنیا کے تمام معبدوں سے زیادہ محترم ہے۔

حجر اسود عہدِ ابراہیمی میں پیمان عام لینے کا یہ دستور تھا کہ ایک پتھر رکھ دیا جاتا جس پر لوگ آکر ہاتھ مارتے۔ اس کے معنے یہ تھے کہ جس عہد کے لیے وہ پتھر رکھا گیا ہے اس کو اُنہوں نے تسلیم کر لیا۔

حضرت ابراہیمؑ نے جب کعبہ تعمیر کیا تو اس کے ایک کونے پر عہد کے لیے ایک کالا پتھر جس کو حجر اسود کہتے

ہیں نصب کر دیا کہ اس گھر میں جس کی بنیاد اکیلے معبود کی پرستش پر ہے جو کوئی داخل ہو پہلے اس پر ہاتھ رکھ کر توحید کا عہد باندھے پھر طواف کرے یعنے اس گھر کے اردگرد سات چکر لگائے۔ گویا وہ اپنے آپ کو اس کی توحید پر جس کی عبادت کے لیے یہ گھر ہے نثار کرتا ہے۔ اگر جان بھی دینی پڑے گی تو اس سے منحرف نہ ہوگا۔

اس پتھر میں نہ کوئی طاقت ہے نہ کوئی قوت۔ نہ یہ جنت کی چٹان ہے نہ عرش معلے کا فرش۔ صرف تجدید عہد ابراہیمی اور پیمان حنیفیت کے لیے ایک نشان ہے اور بس۔ اس کو چھونے یا ہجوم کی صورت میں دور ہی سے اس کی جانب ہاتھ اُٹھا دینے کو استلام کہتے ہیں۔ چوں کہ یہ توحید کا مقدس پیمان ہے اس لیے ہاتھ یا پتھر کو چوم بھی لیتے ہیں مسجدِ حرم میں پہونچ کر سب سے پہلا کام یہی استلام ہے جس سے طواف شروع ہوتا ہے۔

نادان ہیں وہ لوگ جو عہد توحید باندھنے والوں پر سنگ پرستی کی تہمت لگاتے ہیں۔ حج کے جتنے اعمال ہیں وہ تو سارے کے سارے شرک کے مذبح ہیں۔ حجاج کی امتیازی صفت قرآن میں یہ ہے "حنفاء للہ غیر مشرکین بہ" یعنے وہ اللہ کی طرف ایک رُخ ہونے والے ہیں۔ کسی کو اس کا شریک بنانے والے نہیں۔

طواف یہ نظارہ کس قدر روح پرور ہے۔ سینکڑوں ہیں جو حجرِ اسود کی طرف ہاتھ اُٹھا کے طواف شروع کر رہے ہیں۔ ہزاروں ہیں جو پروانہ وار گھوم رہے ہیں۔ اور اللہ کے نام اس کی توحید اور اس کے آستانہ پر نثار ہو رہے ہیں۔ دل سینوں میں اُچھل رہے ہیں۔ آنسو آنکھوں سے اُبل رہے ہیں اور منہ سے دعائے طواف کے کلمات نکل رہے ہیں۔

کچھ کعبہ کی چوکھٹ تھامے خشوع اور خضوع کے ساتھ استغفار میں محو ہیں۔ بیسیوں خلاف کعبہ سے لپٹے ہوئے گریہ وزاری کر رہے ہیں۔ بہت سے دیواروں سے لگے ہوئے سجدے میں پڑے ہیں اور رو رو کر دعائیں مانگ رہے ہیں۔ ایک وارفتگی کا عالم ہے جو سارے مجمع پر چھایا ہوا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساحتِ قرب کی طنابیں کھنچ گئی ہیں اور جلال کبریائی سے قلوب پگھل پگھل کر پانی ہو رہے ہیں۔

یوں تو اللہ تعالےٰ کہاں اور کب نہیں ہے مگر بعض بعض مکان و زمان کو اس نے خاص خاص خصوصیتیں دے رکھی ہیں جو دوسروں میں نہیں ہیں۔

مقام ابراہیمؑ طواف کے بعد اس تجلی گاہ میں آتے ہیں جو مطاف کے حاشیہ پر ہے یہ معمار کعبہ حضرت

ابراہیمؑ کا مقام ہے جہاں سنگِ مرمر کا ایک حجرہ اور سائبان بنا ہوا ہے۔ یہ خاص قبولیت کا مصلّے ہے یہاں شکر کا دوگانہ ادا کرتے ہیں۔ اور دل کا خون آنکھوں سے بہاتے ہیں۔

سعی صفا اور مروہ میں دو فرلانگ سے زیادہ فصل نہیں جس میں نیچے ابن سعود کی بنائی ہوئی پختہ سڑک ہے اور اوپر ترکوں کا ڈالا ہوا سائبان مسجد حرم سے مشرق کی جانب پہلا قدم جو باہر رکھا جائے گا وہ اسی سڑک پر پڑیگا جس میں دو رویہ بازار ہے اور مکّے کا بڑا بازار۔

طواف کر کے حجاج سعی کے لیے نکلتے ہیں کہ یہ بھی شعائرِ الٰہی میں سے ہو کہا جاتا ہے کہ ایک متبرک ہستی نے پانی کی جستجو میں ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان بے تابانہ چکّر لگائے تھے اور اس کی یہ ادا ربّ العزت کو بھا گئی تھی۔

سعی میں بھی دلوں میں وہی رقت ہے اور وہی سوز و گداز۔ تیز گامی بھی ہے اور آہستہ خرامی بھی۔ کبھی حمد و ثنا ہے اور کبھی استغفار و دعا۔ سات بار دوڑتے ہیں اور ہر دوڑ میں وہی محویت ہے اور وہی استغراق۔ جھنڈ کے جھنڈ ہیں۔ مگر ایک کو دوسرے کی خبر نہیں۔ سڑک کے دونوں جانب دوکانیں کھلی ہوئی ہیں اور خرید و فروخت جاری ہے لیکن یہ گدایان آستانہ کسی اور ہی دھن میں ہیں۔ ان کو کچھ خبر نہیں کہ کدھر بازار ہے اور کیسا کاروبار۔ ان کا سودا ہی اور ہے۔

سعی سے فارغ ہو کر تمتع یعنے خالی عمرہ کی نیت کرنے والے جامۂ احرام اتار دیتے ہیں۔ کیوں کہ ان کا کام پُورا ہو گیا۔ اب جس دن حج کو روانہ ہوں گے تو پھر اس کو پہنیں گے۔ لیکن قِران یعنے حج و عمرہ دونوں کی ساتھ نیت کرنے والے ابھی اسی فقیرانہ لباس میں رہیں گے تاوقتیکہ جملہ مناسک حج پورے نہ کرلیں۔

عرفات میدان عرفات جہاں حج ہوتا ہے مکّے سے ۱۵ میل کے فاصلے پر ہے آٹھویں تاریخ کو روانگی ہوتی ہے۔ راستہ بھرا پڑا ہے اونٹوں کی چار چار قطاریں ایک ایک ساتھ چل رہی ہیں، ہزاروں گدھوں پر سوار ہیں۔ لاکھوں پیدل۔ سب کے سب کسی خاص دھن میں ہیں نہ بات ہے نہ چیت۔ نہ شور ہے نہ ہنگامہ۔ شام کو منا میں پہنچے۔ رات کو وہیں منزل رہی۔ صبح کو پھر کوچ ہوا۔ دوپہر تک اس میدان میں داخل ہوئے جو حج کی جگہ ہے اور جس کی کشش ان سب کو کھینچ کر لائی ہے۔ کارواں پر کارواں پہنچ رہے ہیں، اور جہاں تک نگاہ جاتی ہے ڈیرے ہی ڈیرے لگے ہیں۔ عہدِ ازلی کے متوالے خمخانۂ الست کے سرشار پیمانۂ حنیفیت کے

سرمست، مغرب، مشرق، شمال، جنوب دنیا کی چاروں سمتوں سے دور و دراز راہوں سے سمندروں کو عبور اور بیابانوں کو قطع کرتے ہوئے یہاں آئے ہیں اور اپنے مالک کی حضوری میں حاضر ہوئے ہیں۔ سب توحید کے فرزند۔ آپس میں بھائی بھائی ایک ہی لباس۔ ایک ہی بھیس اور ایک ہی رنگ میں۔ ایک ہی آستانہ کے پجاری اور ایک ہی در کے بھکاری جلتے ہوئے پتھروں پر۔ تپتی ہوئی دھوپ میں سر کھولے اور ہاتھ پھیلائے اللہ کے سامنے کھڑے ہیں اور درد بھرے دل کو اس کے آگے اُنڈیل رہے ہیں۔ دعائیں ہیں اور التجائیں۔ تسبیح ہے اور تہلیل، گناہوں کا اقرار ہے اور توبہ و استغفار۔

یہ موقع زندگی میں کسی خوش قسمت ہی کو نصیب ہوتا ہے جو مانگنا ہو مانگ لو، جو مقصد ہو طلب کر لو۔ دین کے لیے بھی اور دنیا کے لیے بھی۔ اپنے لیے بھی اوروں کے لیے بھی۔ کوئی مدعا رہ نہ جائے۔ کوئی آرزو چھوٹ نہ جائے۔ بڑے کریم کا دربار ہے جو یہاں آنے والوں کو محروم نہیں کرتا۔

لیکن ہائے ہائے اس اجتماع میں یہ انفرادیت؟ بھائیوں سے بھائی خبر تک نہ ہوئے۔ نہ ایک نے دوسرے کو جانا، نہ دل کی راہیں کھلیں۔ نہ آپس کے دکھ درد معلوم ہوئے۔ رشتۂ اخوت کہاں گیا؟ شیرازۂ الفت کیوں ٹوٹا ہوا ہے؟"

خطیب جو رسول پاک کے منبر پر کھڑا ہوا وہ بھی کچھ نہ بولا۔ ایک ڈھلا ہوا مصنوعی خطبہ مقفیٰ و مسجع پڑھ کر اُتر آیا۔ نہ ضروریات ملت کی خبر نہ شناسائی۔ نہ حالاتِ امت پر نظر نہ رہنمائی۔ خالی رسم کی خانہ پُری تھی۔ صرف قافیہ بندی کی داد طلبی اور محض بے مغزی کا مظاہرہ۔

ضرورت تھی کہ عرفات میں مسلمان اقوام کا تعارف ہوتا۔ باہم میل جول اور راہ و رسم پیدا کرتے جس سے ساری اُمت ایک رشتے میں منسلک ہو جاتی۔ کیوں کہ حج اُمم اسلامیہ کے لیے سب سے بڑا اجتماعی مظہر ہے جس میں اکناف و اطرافِ عالم سے ہر قوم کے مسلمان آکر ایک جگہ جمع ہوتے ہیں۔ اس لیے مناسب صورت یہ ہے کہ جس جس ملک یا قوم کے لوگ یہاں آئیں وہ پہلے سے اپنا اپنا ایک امیر حج منتخب کر لیں۔ یہ امرا مکے میں پہنچ کر باہم ملیں۔ تبادلہ خیالات کریں۔ پھر انہیں میں سے ایک منتخب دماغ عرفات کے مجمع عام میں ایک خطبہ پڑھے جس میں ملت کی اجتماعی حالت پر تبصرہ ہو، ان کی رہبری کی جائے اور کم سے کم ایک سال کا اجتماعی لائحہ

عمل اُن کے سامنے پیش کیا جائے۔

منبر ہادیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے منبروں کو ہدایت کے لیے نصب فرمایا ہے۔ ان کا رشتہ قلوب کے ساتھ ہے کیوں کہ ان سے جو آوازیں نکلتی ہیں وہ دلوں تک نفوذ کرتی ہیں۔ یہ بمنزلہ برقی بیٹری کے ہیں جن سے دلوں کے قمقموں میں روشنی اور حرارت پہنچتی ہے۔ ان سب کا مخزن میدان عرفات کا منبر ہے جو افسوس ہے کہ مدتہائے دراز سے خاموش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امّت کے قلوب بے نور۔ افسردہ منتشر اور متفرق ہیں تنظیم کی صورت صرف نصبِ مرکزیت ہی اور کچھ نہیں۔ کیوں کہ مرکز کی طرف ہر فرد متوجہ ہو جاتا ہے جس سے خود بخود ساری قوم منظم ہو جاتی ہے جیسے شمع کہ اس کے روشن ہوتے ہی گھر کی کل چیزیں اپنی اپنی جگہ پر نظر آنے لگتی ہیں۔ افراد یا جماعتوں یا دیہات یا مسجدوں سے جو لوگ اُمّت کی تنظیم کرنا چاہتے ہیں اُن کو ہمیشہ ناکامیابی ہوگی۔ کیوں کہ یہ اُلٹا راستہ ہے۔

مزدلفہ عرفات میں حج سے فراغت کے بعد غروب آفتاب کے وقت وہاں سے واپسی شروع ہوتی ہے اور قافلے مشعرحرام کے پاس آکر ٹھہرتے ہیں۔ بالعموم لوگ یہاں پہنچکر کچھ کھا پی کر سو رہتے ہیں اور بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو اللہ کی یاد کرتے ہیں۔ حالاں کہ قرآن نے خصوصیت کے ساتھ یہاں ذکرِ الٰہی کا حکم دیا ہے یہ ذکر انفرادی نہیں ہونا چاہیے کہ اکیلے بیٹھ کر تسبیح و تہلیل کر لی بلکہ اجتماعی ہونا چاہیے۔ کیوں کہ حج کے کل کام اجتماعی ہیں۔ یہاں عظیم الشان محفلِ ذکر ترتیب دینے کی ضرورت ہے کہ جس میں سب لوگ شریک ہوں اور کم سے کم رات کا ایک حصّہ حمد و ثنا تذکیر و موعظہ وغیرہ میں صرف ہو اور شکریہ کی نظمیں پڑھی جائیں۔

قربان گاہِ خلیل صبح کو مزدلفہ سے اُٹھ کر نماز فجر کے بعد لوگ منا میں آجاتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں توحید کے پیشوائے اعظم اور حنفا کے سرگروہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے اسماعیل کو اللہ کے حکم کے مطابق قربان کرنے کے لیے پیشانی کے بل زمین پر لٹا دیا تھا اور چھُری نکال چکے تھے کہ آسمانی رحمت نے ہاتھ تھام لیا اور کہا کہ بس تم اپنی طرف سے سب کچھ کر چکے اور اس کڑے امتحان میں پورے اُتر گئے۔ اسی کا فدیہ یہ ذبح عظیم ہے کہ ہر سال دینِ حنیف کے شیدائی اور ملّتِ ابراہیمی کے فدائی لاکھوں ذبیحے یہاں اللہ کے نام پر قربان کر کے سنتِ خلیل اللہ کو تازہ کرتے ہیں۔

قربانی یہ مجمع جو اقصائے عالم سے آکر جمع ہوا ہے۔ بیت اللہ کا زائر اور اپنے رب کریم کا مہمان ہے اس لیے

اس نے اپنے بندوں پر جن کو استطاعت دے رکھی ہے یہ فرض عائد کیا ہے کہ ان ضیوف کی میزبانی کریں جس کے بدلے میں ان کو اجر اور ثواب ملے گا۔ دور دور کے ذی مقدرت بھی جو خود نہ حاضر ہو سکیں جانوروں کو قربانی کے لیے بھیج کر اس میں حصہ لے سکتے ہیں۔ یہی قربانی کی اصل حقیقت ہے۔ یعنے اس کی غرض حجاج کی ضیافت ہے نہ کہ محض خونریزی۔ اللہ کا حکم یہی ہے۔

"قربانی کو خود بھی کھاؤ اور قناعت پیشہ اور مصیبت زدہ لوگوں کو بھی کھلاؤ"۔ قربانی کے بعد حج کی تکمیل اور اس فریضہ سے سبک دوشی ہو جاتی ہے۔ اب کھانا ہے اور کھلانا اور فرق مراتب کا لحاظ۔ اس وجہ سے مساوات کے لباس جامۂ احرام کی ضرورت نہیں رہتی۔ حجاج سر منڈاتے، بال ترشواتے اور ناخن کٹاتے ہیں اور صاف ستھرے ہو کر اپنے کپڑے پہن لیتے ہیں۔ تین دن تک مجمع رہتا ہے اور تینوں دن قربانیاں ہوتی ہیں۔ یہی ایام تشریق ہیں۔

صدیوں سے اس قربانی کی جو حالت ہو رہی ہے اس کا بیان تکلیف دہ ہے۔ لاکھوں جانور ذبح کر کے ڈال دیئے جاتے ہیں۔ جنکو کھانے کے لیے گدھ اور گیدڑ بھی نہیں ہوتے۔ آخر ان کو دفن کر دینا پڑتا ہے۔

یہاں بھی تنظیم کی ضرورت ہے۔ ہر ہر قوم کے ڈیرے جداگانہ قطعات میں لگیں۔ کل رقم قربانی کی اس قوم کے امیر کے پاس جمع کی جائے اور وہ اپنی جماعت کے اندازہ اور ضرورت کے مطابق قربانیاں کرے۔ ایک جگہ پکوائے اور ایک ساتھ سب مل کر کھائیں۔ اقوام مسلمہ جن کا دماغی تعارف امرار کے ذریعے سے مکے اور عرفات میں ہو چکا ہے۔ یہاں ایک دوسرے کی میزبانی اور مہمانی کر کے باہم ملیں جلیں۔ جسمانی تعارف پیدا کریں اور باہمی اُلفت و موانست۔

ان ایام تشریق میں ہر جماعت کے امیر کو اپنے ہمراہیوں کو عرفات کا خطبہ اپنی زبان میں سمجھا دینا چاہیئے تاکہ جو حاجی وہاں سے پلٹ کر اپنی بستی میں آئے وہ عرفات کے منبر کا پیغام ساتھ لائے اس سے تمام عالم اسلامی میں ایک اجتماعی روح پیدا ہو جائے گی۔

رمی جمرات منا میں تین جگہ تین نشانات بنے ہوئے ہیں جو شیطان سے تعبیر کیے جاتے ہیں۔ ان پر حجاج تینوں دن کنکریاں مارتے ہیں۔ گویا اس رجم سے اس عدوئے دین پر جو انسان کو فریب دے کر تعمیل فرمان

اور توحید الٰہی سے روکتا ہے لعنت کرتے ہیں۔ یہ دستور اسلام سے پیشتر سے چلا آتا تھا۔ اسلام نے بھی اس کو قائم رکھا۔ قرین قیاس یہ ہے کہ رمی جمار کی تاریخ عہدِ ابراہیمی سے نہیں بلکہ اصحاب فیل کے واقعہ سے تعلق رکھتی ہے جو کعبہ کو ڈھانے آئے تھے۔ اہل مکہ نے جو اس طاقت ور لشکر کے ساتھ رو در رو مقابلے کی طاقت نہیں رکھتے تھے ان تینوں جگہوں پر پہاڑ سے ان پر پتھراؤ کیے تھے۔ جیسا کہ "ترمیہم بحجارۃ مّن سجّیلٍ" سے ظاہر ہوتا ہے۔ کیوں کہ "ترمی" کا فاعل بھی وہی مخاطب ہے جو پہلی آیت میں "الم تر" کا فاعل ہے نہ کہ "طیر" جیسا کہ عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں یہ لشکر جب عذاب الٰہی سے ہلاک ہو گیا تو اسکی یاد تازہ رکھنے کے لیے حج سے واپسی کے وقت ہر سال ان تینوں مقامات پر رجم کا دستور مقرر ہو گیا۔ چنانچہ ابرہہ کے راہبر ابو رغال ثقفی کی قبر پر بھی جو مکہ اور طائف کے درمیان مقام مغمس میں ہے ہر عرب جو گزرتا ہے رجم کرتا ہے وداع تین دن یا دو دن جیسا کہ قرآن میں ہے منا میں رہ کر کے میں آجاتے ہیں اور طواف وداع کر کے وہاں سے رخصت ہوتے ہیں۔ اس وقت بھی ایک اجتماع عام کی ضرورت ہے جس میں سب مل کر حمد و شکر کے ترانے گائیں۔ عربی بھی اور عجمی بھی۔ ایرانی بھی اور تورانی بھی اور پھر وہاں سے باہمد گر مل ملا کر رخصت ہو جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر صحیح اصول پر حج ہونے لگے تو اُمّتِ اسلامیہ کے لیے دنیا جنّت بن جائے۔